# باقیاتِ فانی

HaSnain Sialvi

فانی بدایونی

# باقیات فاتحہ

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

# باقیاتِ فانی

HaSnain Sialvi

فانی بدایونی

مکتبہ شاہراہ۔ دہلی

*HaSnain Sialvi*



| | |
|---|---|
| پہلی بار | جون ۱۹۵۸ء |
| دوسری بار | اپریل ۱۹۶۳ء |
| تعداد | [illegible] |
| قیمت | تین روپے |

(یونین پرنٹنگ پریس دہلی)

HaSnain Sialvi

# اردو شعر و شاعری پر ایک نظر

## بابِ اوّل

## بسلسلۂ

## (مقدمۂ دیوانِ فانی)

مرتبۂ رشید احمد صدیقی علیگ

دُنیا کے تقریباً تمام اہلِ نظر اس امر میں متفق ہیں کہ ملکۂ شعر ایک عطیۂ فطرت ہے جو اکتساب سے حاصل نہیں کیا جاسکتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف شاعر بلکہ کائنات عالم کا ذرّہ ذرّہ ایک مخصوص انداز ایک ممتاز تشخص، ایک جدگانہ نشان "اناء" رکھتا ہے۔ اسی انانیت کو صوفیہ نے مظہرِ وحدت گردانا ہے اور غالب نے اسی نظریہ کی ترجمانی کی ہے

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں      ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

عام طور پر ہم اسے فطرت، جبلت، سرشت یا شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں انواع سے لیکر افراد تک اس قانونِ فطرت کی ہمہ گیری یکساں ہے البتہ جو نوع بہ اعتبارِ خلقت بلند تر ہوتے ہیں۔ اس کے افراد میں یہ نوعی اور انفرادی امتیاز زیادہ نمایاں ہوتا ہے

خود انسان کو لے لیجئے باوجود اس کے کہ اس پر اختلاف آب و ہوا تغیراتِ جنسی و جسمانی، تعلیم و معاشرت، رسوم و روایات کے بے شمار انقلاب و حادث گذر گئے، نوعی اعتبار سے اس بیسویں صدی کا متمدن انسان بھی وہی انسان ہے جو آغازِ تمدن سے پہلے رہا ہوگا اور آج بھی جبکہ مجلس بین الاقوام اور روشن خیال مستورات کی کار فرمائی ہے وہ اپنے آپ کو انسانیت کی نوعی تقویم اور مخصوص سرشت سے آزاد نہیں کرسکا ہے۔ اس نے جتنے قوانین یا پابندیاں اپنے یا دوسروں کے لئے وضع کیں ان میں اب بھی ہبوطِ اولین کی ساری سرفرازی یا نگونساری کی ودیعت ہے۔ غرضکہ ایک طرف تو وہ قدرِ مشترک جس کا نام انسانیت ہے تمام بنی آدم میں یکساں ہے دوسری طرف طبعی رجحانات اور فطری خصوصیات کے لحاظ سے ہر فردِ انسانی بجائے خود ایک جداگانہ عالم ہے۔ ماحول کے اثرات معاشرت کے تغیرات، تعلیم و تربیت کے فیوض ممارست و مشق کی جلدکاری اس کے ظاہری آب و رنگ میں امتیاز پیدا کردیں تو کردیں، فطرت کے خدوخال کب چھپتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ فلاں صفت وہبی ہے اور فلاں اکتسابی کیونکہ خصوصیتاً یہ وہی فطری میلان ہے جو سعی و اکتساب کی طرف رہبری کرتی ہے۔

یہ فلسفہ یا منطق کا مسحورکن یا مسکت مغالطہ نہیں، بلکہ یہ ایسی بین حقیقت ہے جو بدیہی ہونے کی حیثیت سے کسی تاویل یا تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ جن افراد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی خاص فن میں کوئی خاص کمال یا ملکہ محض محنت و اکتساب سے

HaSnain Sialvi



پیدا کر لیا ہے ان کے متعلق یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیوں اس خاص شعبہ میں تحصیل کمال اور سعی و محنت کے لئے متوجہ ہوئے اور کسی دوسری صفت کے لئے جانفشانی اور جگر کاوی کیوں نہ گوارا کی۔ ایک شخص کسی مخصوص استعداد کی تحصیل میں محنت کرتا ہے جس میں کم و بیش کامیاب ہوتا ہے۔ ظاہر بین نگاہیں جو فطرتِ انسانی کی مخفی رجحانات اور لامحدود امکانات سے ناواقف ہیں۔ دیکھتی ہیں کہ یہ حاصل شدہ کمال باہر سے آیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ذوقِ طلب کی تعنگی خود اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ سرچشمہ فیض اُبلنے کے لئے آمادہ ہے۔ ابتدا میں خود صاحبِ کمال اپنی استعداد مخفی سے بے خبر رہتا ہے مگر بیچین نہیں ہوتا فطری صلاحیت کا یہی احساس ہے جو قوائے عمل کو بیکار کرتا ہے۔ ہر انسان کو آغاز شعور سے اپنے فطری مذاق کے مطابق ایک ناقابل بیان خلش یا طلب محسوس ہوتی ہے۔ حالات موافق رہے اور زمانہ نے مساعدت کی تو فطرت کا یہی شرارۂ مخفی شعلۂ طور بن کر بھڑک اٹھتا ہے، غالب نے کس لطیف انداز سے اس راز کو بے نقاب کیا ہے ؎

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پھر اس نظریہ کے ماتحت ہر وہ شخص جس نے کسی نہ کسی فن میں خاص مہارت بہم پہونچائی ہے وہ اس شخص کا ہم پلہ ہے جس میں یہ استعداد یا ملکہ فطری ہے اور اس طور پر نام نہاد اکتسابی اور وہبی استعداد میں افادیت کے نقطۂ نظر سے کوئی فرق نہیں ہے لیکن یہاں افادیت کے نقطۂ نظر سے بحث کرنی

بے محل ہے۔ سوال استعدادِ فطری کی کمی بیشی یا آگہی و بیداری سے ہے جس میں یہ ملکہ فطری طور پر اور پوری قوت کے ساتھ موجود ہوتا ہے وہ استعداد کو نہایت جلد نہایت خوبی کے ساتھ اور نہایت آسانی سے کارفرما کر سکتا ہے۔ دوسرے لوگ جنہوں نے اس ملکہ کو مشق و ممارست سے بہ تکلف پیدا کیا ہے وہ نسبتاً دیر میں، معمولی طور پر اور دقت کے ساتھ اس کو بروئے کار لا سکتے ہیں اور یہ فرق کوئی معمولی نہیں ہے۔

اس کُلیہ کے تحت میں جب ہم کائناتِ فطرت کا مطالعہ یا مشاہدہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام موجودات جن سے ہم کسی نہ کسی طور پر باخبر ہو سکتے ہیں۔ خواہ ان کا وجود محسوس و مرئی ہو یا ذہنی و خیالی ان کی ایک حیثیت تو ذاتی ہوتی ہے، اور دوسری اضافی جو دوسری اشیاء و موجودات کی نسبت سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی دوسری حیثیت کا سب سے نمایاں پہلو وہ نسبتِ اضافی ہے جو انسان کو موجوداتِ عالم سے ہے۔ یہ حیثیت فاعلی بھی ہوتی ہے اور انفعالی بھی یعنی ہم نے ان کو کب جانا، کیونکر جانا اور کس حد تک ان کی تسخیر میں کامیاب ہوئے اور ان کو اپنی ارادت اور افعال کا تابع بنایا اور خود ان سے کس حد تک اثر پذیر ہوئے۔ یہی شے ہے جو حقیقت میں ارتقائی تمدن کا معیار ہے۔

یہاں پہونچکر مسئلہ زیرِ بحث کی نوعیت اَور پیچیدہ ہو جاتی ہے ایک ہی شے کو مختلف طبائع مختلف رنگ میں دیکھتی اور سمجھتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس میں کون قرینِ حقیقت ہے۔ سب سے مشہور مثال مُناظرِ نابینائی اور شاعر کی ہے ان میں سے ہر ایک نے

اپنے اپنے میلان اور مشغلہ کی مناسبت سے آفتاب کی مختلف تعبیریں کی تھیں اور کسی ایک کے فیصلہ کو غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بظاہر یہ بات مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں ایک بڑی حقیقت پوشیدہ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اپنی خصوصیات فطری کے اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں جن میں کبھی فرق نہیں آتا لیکن دنیا میں جتنے انسان ہیں وہ باعتبار طبائع آپس میں مختلف ہیں اس لئے خارجی اثرات سے وہ مختلف طور پر متاثر بھی ہوتے ہیں، ہوا چلتی ہے، اس کی حرکت ایک مستقل حیثیت اور میلان رکھتی ہے لیکن مختلف سازوں سے برآمد ہوتی ہے تو مختلف آوازیں پیدا ہو جاتی ہیں، پہاڑوں، وادیوں، جنگلوں اور مرغزاروں سے گزرتی ہے تو ہر جگہ سے بظاہر مختلف لیکن مجموعی طور پر ہم آہنگ نغمے نکلتے ہیں، دوسری جانب "ساز انسانی" ہے جو اس درجہ متنوع اور پیچیدہ واقع ہوا ہے کہ اس کا ہر پردۂ ساز" ایک مستقل "نوائے راز" پیدا کرتا ہے یہ نغمے اضطراری اضطراری مگر ان پر شعور اور اختیار کی مرصع کاری ہوتی ہے، وہیں سے ہر قسم کی دشواری یا برتری کا آغاز ہوتا ہے اور یہی وہ "طغرائے امتیاز" ہے جس کی بنا پر انسان کو اشرف المخلوقات مانا گیا ہے اور "خلافت الٰہی" کا شرف دیا گیا ہے۔

**شعریت**[۱] | عالم ہستی کی سب سے مکمل مخلوق انسان ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ دنیا کی دیگر مخلوقات کے علاوہ اور ان سے

---

[۱] یہ لفظ فاعلی اور انفعالی دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے، مگر یہاں صرف فاعلی زاویۂ نگاہ سے بحث ہے

کہیں زیادہ موجوداتِ عالم کے رازہائے حقیقت سے واقف ہونے کی استعداد رکھتا ہے تجسس اس کی فطرت ہے اس کی تمام مساعی کا محور یہ ہے کہ کائنات کے پوشیدہ حقائق کو دریافت کرے ان کا باہمی توازن معلوم کرے اور پھر ان کو فرداً فرداً یا مجموعی طور پر عالمِ انسانیت سے ہم آہنگ بنائے وہ حقائق کو بے نقاب نہیں کرتا بلکہ اشارہ، تمثیل، تقریر یا تحریر سے ان حقیقتوں کو دوسروں کے لئے جو باعتبارِ استعداد و قابلیت اس سے فروتر ہوتے ہیں سریع الفہم اور سہل الحصول بنا دیتا ہے، ان کے امکانات کی توسیع کرتا ہے اور بالآخر ان کو زندۂ جاوید بنا دیتا ہے لیکن ان حقیقتوں سے آشنا اور لطف اندوز ہونے کے لئے ایک مخصوص رجحانِ ذہنی کی ضرورت ہوتی ہے جس سے ہر کس و ناکس آگاہ نہیں ہوتا۔ ہر شے واقعہ یا حالت کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرنا ان کے مخصوص مخفی اور دلکش شعبوں کو دریافت کرنا، ان کے ظاہر و باطن، حرکت و سکون زیر و بم۔ نشیب و فراز، رنگ و بو اور کیف و کم سے متاثر اور ہم آہنگ ہونا "شعریت" ہے۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو ہم کو سود و زیاں، تکلیف و راحت، شہرت و گمنامی سے بے نیاز کر دیتا ہے لیکن اس طور پر نہیں کہ رہبانیت کی محرومی یا نام نہاد تصوف کی اجل زدگی ہماری زندگی پر محیط ہو جائے بلکہ شعریت کا ملکہ ہم کو زندگی کی تلخیوں کو محسوس نہیں ہونے دیتا اور رزمِ حیات کی کامیابیوں میں معین ہوتا ہے۔

شعریت "حقیقت آگہی" کا ایک دلکش اور جامع مترادف ہے حقیقت سے باخبر ہونا ایک ایسی نعمت و سعادت ہے اور وہ ہماری مسرتوں کا ایسا لامحدود اور

HaSnain Sialvi



لازوال سرچشمہ ہے کہ اس کی لے دریغ بخششوں کے مقابلہ میں زندگی کی ساری تلخیاں ہیچ محسوس ہونے لگتی ہیں شعریت سے مراد منظوم حماقتیں نہیں ہیں اور نہ اس سے شاعروں کا مخصوص انکسار بددماغی یا جلبہ ہے۔ ترک موالات کی مانند شعریت ایک طرح کا میلانِ ذہنی ہے۔ یہ ایک ایسی اُمید ہے جو کبھی مایوسی میں نہیں تبدیل ہوتی، کوئی انسان خواہ وہ سفرِ حیات کی کسی منزل میں ہو اور اس کا شغلِ زندگی کچھ ہی کیوں نہ ہو اگر وہ اپنے کام میں خوشی محسوس کرتا ہے اگر وہ اپنی زندگی کے جواز میں اپنی ہی زندگی پیش کر سکتا ہے، اگر وہ اپنی زندگی کو انعامِ الٰہی سمجھتا ہے، اگر اس نے اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں کوئی ایسی مسرت محسوس کی ہے جس کے حصول میں خود اسکے قول یا فعل کو دخل رہا ہے، اگر وہ اپنی زندگی کا محاسبہ کر کے اسکے نتیجہ سے مسرور یا محزوں ہوتا ہے بالفاظِ دیگر ایسا انسان جو اپنے ہی عمل کو اس عمل کی سزا یا جزا سمجھتا ہے شعریت سے آشنا ہے۔ اس تفصیل پر غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ کوئی شخص خواہ وہ عرفِ عام میں شاعر کہلائے یا سائنس داں آقا یا غلام، مریض یا تندرست، مفلس یا تونگر، موحد یا ملحد کچھ بھی کیوں نہ ہو اگر متذکرۂ صدر خصوصیات میں سے کسی ایک کا بھی حامل ہے تو وہ شعریت سے بہرہ ور ہے۔

## شاعری

شعریت کے بعد ہم کو شاعری کا جائزہ لینا چاہیئے، اب تک شاعری کی جتنی تعریفیں کی گئی ہے ان سب میں باوجود اسکے کہ اتنے الفاظ میں شعریت کا تذکرہ نہیں کیا گیا سب نے بالاتفاق اسی استعداد کو

پیشِ نظر رکھ کر اظہار مطالب کیا ہے بعضوں نے شاعری کے سلسلہ میں یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ اب تک جو تعریف شعر کی کی گئی ہے وہ صرف "تعریف" ہے۔ اچھے اور بُرے شعر کا کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ اعتراض بجائے خود کچھ زیادہ اہم نہیں ہے کیونکہ شعر سے مراد محض تک بندی یا وزن و قافیہ کی بے جان میکانیکی پابندی نہیں ہے۔ تعریف (ڈفنیشن کے مفہوم میں) ہمیشہ آئیڈیل کی کی جاتی ہے اور صحیح آئیڈیل وہ ہے جہاں تک رسائی ناممکن ہو اس لئے بہترین اشعار بھی آئیڈیل کے حدود تک نہیں پہنچتے۔ نظر براں یہ بے جا نہیں ہے کہ شعر کی منطقی حد (تعریف) ایسی کی جائے جو صرف صحیح نمونوں پر منطبق ہو سکتی ہو۔ بُرے اشعار کی بحیثیت فنِ شاعری کوئی اہمیت نہیں ہے اس لئے اس کو نظر انداز کرنا بے جا نہیں ہے۔

شعریت جیسا کہ اس سے پہلے ظاہر کیا گیا ہے ایک ذوق، ایک وجدان یا ایک قسم کا میلانِ ذہنی ہے جس کا تعلق براہِ راست "انسانیت" سے ہے۔ یہ ایک اُفتادِ طبع ہے۔ اس وجدان کی صحیح کارفرمائی اور پھر اس کی صحیح و دلکش ترجمانی کرنا اور اس کو مرئی اور متشکل بنانا لیکن اس انداز اور سلیقہ سے کہ تصور اور تصویر میں بیش از بیش مناسبت ہو شاعری ہے یہ شاعری کا وسیع ترین مفہوم ہے اور اس میں ہر انسانی فعل آسکتا ہے مثلاً نظم و نثر، تحریر و تقریر، نقاشی و مصوری، موسیقی، رقاصی، تعمیر اور وہ تمام اقوال و اعمال جن میں اڈیٹر صاحب صحیح قابلِ تحسین یا سزاوار

سر دُھنتے ہیں لیکن یہ ترجمانی کس طور پر ہونی چاہیئے اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے ایک نہایت وسیع اور پیچیدہ مسئلہ ہے جس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کم از کم ہندوستان کے اُردو شعرا کو سخت ضرورت ہے۔ اس لئے اس موقعہ پر ایک حد تک بسط و تفصیل ضروری ہے۔

۱۔ آج کثرت سے ایسے شعرا ملیں گے جن کو الفاظ اور اوزان پر غیر معمولی قدرت ہوتی ہے۔ ان کے ذہن میں کوئی خیال نہیں ہوتا چونکہ الفاظ و تراکیب پر قدرت ہوتی ہے وہ بلا تامل ان کو مختلف طور پر ترتیب دے دیتے ہیں اور بعد میں دیکھتے ہیں تو ان میں معانی و مطالب بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض الفاظ اور فقرے ایسے ہیں جن کو کسی نہ کسی طور پر کہیں نہ کہیں رکھ لیجئے ایک طرح کا مترنم موہوم اور غیر متعین مفہوم خودبخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ان الفاظ و فقرات کے معانی و مطالب پر غور کرنے کی شاعر کو ضرورت نہیں محسوس ہوتی کیونکہ سامعین کا زیادہ حصّہ ایسا ہوتا ہے جو ان الفاظ پر محض برجائے عقیدت یا لاعلمی سر دُھننے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس میں سے بعض الفاظ یہ ہیں بادۂ عرفان، عہدِ الست، برقِ طور، وادیِ ایمن، ترانۂ منصور خمارِ ہستی، خوابِ عدم، صبحِ ازل، خوابِ زلیخا، فریبِ ہستی،

HaSnain Sialvi

طلسمِ مجاز، آبلہ پا، جنونِ خرام، عَرَض و جوہر وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ دوسرا گروہ ایسا ہے جو لکھنے سے پہلے سوچتا بھی ہے لیکن، ان کے تصور و تخیل کی دُنیا وہی فرسودہ اور پامال زمین ہے جس پر ہزاروں قافلے گذر چکے ہیں، یہ طبقہ عموماً بڑے بڑے شعرا کے نتائجِ فکر کو سامنے رکھ کر خیال آرائی کرتا ہے بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ یہ لوگ اساتذہ کے الفاظ اور بندشوں کی نقل تو کسی حد تک کر لیتے ہیں لیکن خیالات کی وسعت اور عمق کو نہیں پہونچتے۔ کبھی صورتِ حال برعکس ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ ہم اساتذہ کے مدِمقابل ہیں۔ حالانکہ اُن کی نفسیاتی غلطی ہے کہ ایسے لوگ شعریت کے مفہوم سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں، ہر شاعر کا ایک مخصوص اندازِ فکر ہوتا ہے اور اسی رجحان کے مطابق اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ وہ اپنے خیالات کو الفاظِ موزوں کا قالب دیتا ہے۔ دوسرے لوگ اس سے ناآشنا ہوتے ہیں اور اسی لئے ناکامیاب رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسلم الثبوت شعراء (ہمارے محترم مولینا اقبال سہیل معاف فرمائیں) دوسروں کے کلام پر اصلاح نہیں دے سکتے بلکہ اکثر شاگردوں کا تقریباً سارا

کلام کاٹ کر اسی زمین میں اپنا کلام حوالہ کر دیتے ہیں۔ اس طریقہ کار سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ شعر و شاعری میں اختراع و جدت کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ دوسرے شعر و شاعری خود فرسودہ ہو جاتی ہے اور بعض ہونہار طبیعتیں یا تو غلط راستہ پر لگ جاتی ہیں یا بالکل بجھ جاتی ہیں۔

۵۔ آج کل زیادہ تعداد ایسے شعرا کی ہے جن کا مبلغِ علم ناکافی ہوتا ہے۔ شاعری کے لئے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ کم از کم ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور ہو۔ اردو کے قدیم اساتذہ فارسی اور عربی میں کامل مشق و مہارت رکھتے تھے۔ موجودہ دور میں صرف اردو سے واقف ہونا شاعر بننے کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں جب جانچنے، تولنے اور پرکھنے پر بہت زور دیا جاتا ہے اور نشر و اشاعت کی غیر معمولی سہولت کی وجہ سے ہر چیز ایک دوسرے کے مقابلہ میں دیکھی، اور جانچی جاتی ہے اردو کا مقابلہ بحیثیت ایک ادب کے صرف عربی، فارسی یا مختلف ہندوستانی زبانوں سے نہیں ہے بلکہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے بھی ہے یعنی انگریزی، لاطینی، فرانسیسی، روسی وغیرہ۔ ان

زبانوں کے مقابلہ میں اردو کو ابھی بہت زیادہ ترقی کرنے کی ضرورت ہے جو صرف اس طور پر پوری ہو سکتی ہے۔ کہ ان ادبیات کا نہایت گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس طور پر حاصل کئے ہوئے نتائج یا تاثرات کو احتیاط اور سلیقہ کے ساتھ اردو نظم و نثر میں اس طرح منتقل کیا جائے کہ ایک طرف بے معنی نقالی نہ ہو اور دوسری طرف اُنکے محاسن اردو ادب میں اس طور پر جذب ہو جائیں کہ بالکل فطری اور اصلی معلوم ہوں۔ لیکن یہ حق ترجمانی صرف اس وقت ادا ہو سکتا ہے جب ہم مطالعہ کتب، مطالعہ فطرت اور وسیع النظر ارباب ذوق کی صحبتوں سے بھی مستفید ہوں۔ پہلے لوگ اگر خود شعر و سخن کا شغل نہیں رکھتے تھے تو کم سے کم شعرا اور علما کی صحبتوں کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس سے طبیعتیں سلجھتی تھیں اور سوسائٹی کا مذاق نکھرتا تھا۔ اس لئے ہر شاعر کے لئے لازمی ہے کہ اسے مختلف زبانوں پر عبور ہو اور ان لوگوں کے فیضِ صحبت سے مستفید ہو جو اس وادی کے نشیب و فراز سے آشنا ہیں اور ایک حد تک قطع مسافت کر چکے ہیں نظم و نثر میں کامیابی اور کمال

حاصل کرنے کے لئے اربابِ ذوق وبصیرت کی صحبت محض اس
خیال سے ضروری نہیں ہے کہ اپنے کلام پر ان سے اصلاح
لیجائے یا ان سے کسی کتاب کا درس لیا جائے یا معلومات
کا سرمایہ فراہم کیا جائے۔ حقیقتاً یہ چیزیں زیادہ ضروری نہیں
ہیں۔ ان سے محض ایک طرح کی عقیدت رکھنا اور اکتسابِ علم
وہنر میں ان کی طرف سے بے توجہ نہ ہونا۔ ان کے ساتھ اٹھنا،
بیٹھنا، گفت وشنید، مزاح و تفریح وغیرہ ایسی چیزیں
ہیں، جن کا اثر اتنا گہرا اور مفید ہوتا ہے کہ آپ سالہا سال
صرف مطالعۂ کتب میں مصروف رہیں وہ باتیں میسر نہ آئیں گی۔
مطالعۂ کتب کا مقصد محض ذخیرۂ معلومات کی فراہمی ہے۔ مگر
ارباب بصیرت کے فیضِ صحبت سے ان معلومات حاصلہ کی
صحیح ترتیب آجاتی ہے اور حصولِ معلومات کا صحیح طریقہ کار
معلوم ہوجاتا ہے اور ذخیرۂ کتب میں جو سرمایہ فراہم ہے اسکے
متعلق اخذ وترک کا صحیح ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔ بظاہر یہ بات
نہایت معمولی اور ایک حد تک مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن
جن لوگوں کو اس کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی
نعمت ہے۔ اس سے مطالعہ میں کتنا لطف آتا ہے اور مطالعہ کا

مقصد اس سے کس حسن وخوبی سے پورا ہوتا ہے۔ بسا اوقات پان پانسو صفحات کی کتاب میں صرف نصف درجن جملے یا الفاظ ایسے مل گئے ہیں جن سے مطالعہ کی ساری کلفتیں دور ہو جاتی ہیں اور ان الفاظ اور فقروں سے ایسی بصیرت اور ایسا انشراحِ صدر نصیب ہوا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

موجودہ دور میں، اُردو نثر و نظم میں جو انقلابات گذر رہے ہیں ان کو دیکھ کر ہم میں سے بعض لوگ خوش ہوتے ہیں بعض کڑھتے ہیں۔ بعض انگشت بدنداں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت تمام دُنیا نئے نئے خیالات اور نئے نئے تجربات کے ورطہ میں ہے اور ایک نامعلوم لیکن موثر طریقہ پر ہمارا ذہن و دماغ ان سے متاثر ہو رہا ہے قدیم و جدید کے تصادم سے جو شعلہ اٹھتا ہے اس نے بہتوں کی نگاہ خیرہ کر دی ہے۔ اُردو شعر و شاعری بھی اسی زد میں ہے۔ وہ لوگ جو ان جدید خیالات اور افکار سے متاثر ہو چکے ہیں یا لطف اندوز ہوتے ہیں وہ اُردو شعر و شاعری کو اسی معیار سے جانچتے ہیں اور قدرتی

HaSnain Sialvi

طور پر مایوس ہوتے ہیں۔

۔ راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ شعر و شاعری میں کثرت کے ساتھ، ایسے الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ جن کا مفہوم غیر متیقن ہے اور بیشتر اُس وقت ایسی ترکیبیں استعمال کی جاتی ہیں جب شاعر کا خود اپنا مفہوم متعین نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات تعین و تفصیل کی جگہ پر اجمال و ابہام خود حُسنِ شاعری کے لئے ضروری ہوتا ہے بلکہ شاعری کا کمال تو یہ ہے کہ سُننے کے ساتھ قلب و دماغ پر ایسی کیفیت طاری ہو کہ اس عالمِ بیخودی میں جزئیات سے بے التفاتی ہو جائے اور نقائصِ شعری بھی (اگر کوئی ہوں) نظر انداز ہو جائیں لیکن کم درجہ کے شعرا اور اکثر بلند پایہ اصحاب فکر بھی اس رعایت یا خصوصیت سے فائدہ نہیں بلکہ نقصان اٹھاتے ہیں اور شعر و شاعری پر اس کا نہایت مضر اثر پڑتا ہے۔

بسا اوقات فضائے تخیل میں ایک جدید خیال کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے اور ہم قبل اس کے کہ خود اس خیال سے حدود معین کریں، اس کی پوری وسعت اس کی

صحیح گہرائی اور اس کے تقیقی وزن پر التفات کریں یہ
سوچنے لگتے ہیں کہ ہمارے ذخیرۂ الفاظ میں کون سا لفظ ایسا ہے
جو کسی نہ کسی حد تک ہمارے اس کارنامہ (فکری) کا احاطہ
کر سکتا ہے اور آسانی کے ساتھ مل سکتا ہے۔ اس معاملہ
میں ہم تفتیش و جستجو سے بھی بچنا چاہتے ہیں، حالانکہ الفاظ
پر غور کرنے سے پہلے ہم کو اپنے خیالات پر عبور حاصل کرنا
چاہیئے اس کے بعد سوچنا چاہیئے کہ ہم کو کون سا لفظ اختیار
کرنا چاہیئے یا ان خیالات کو ظاہر یا واضح کرنے کے لئے
کیا پیرایہ بیان اختیار کرنا چاہیئے۔ اس کی تشریح
حسب ذیل مثال سے کی جا سکتی ہے فرض کیجئے ہم کو کسی
نئی وادی کی تلاش ہے۔ اب یہ تو ناممکن ہے کہ جو منزلیں
ہم طے کر چکے ہیں اور جتنے نشانات منزل ہمارے سفر میں
نظر سے گذرے ہیں انہیں کو ہم اپنے جدید منزل مقصود کے
لئے اختیار کریں ایسا کیا گیا تو ظاہر ہے کہ ہم ہزار چکر
کے بعد پھر اسی نقطہ پر جا پہنچیں گے جہاں سے چلے تھے!
جو ہمارے سامنے آ چکا ہے اور یہ تحصیل حاصل ہوگی۔ اسلئے
نئی منزل مقصود کے لئے لازمی ہے کہ ہم نیا جادہ اختیار

کریں اور نئی منزل کا سراغ لگائیں۔ اس استعارہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ ظاہر کردینا بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات منزلِ مقصود معلوم ہوتی ہے اور ہم نیا راستہ اور نئے نشاناتِ منزل تلاش کرتے ہیں، گویا منزلِ مقصود کا تیقن، راستہ اور نشاناتِ منزل کی تلاش اور دریافت کا محترک اور معین ہوتا ہے۔ دوسری جانب نئے نئے نشاناتِ منزل ملتے ہیں ان سے ایک جدید منزل مقصود کا پتہ لگتا ہے اس طور پر اگر ہمارا خیال یا فکر متعین ہو چکا ہے تو ہم کو نئے نئے الفاظ اور جدید ترکیب اور بندش کی جستجو کرنی چاہیئے۔ دوسری طرف نئے نئے الفاظ کے وجود میں آنے سے ہم کو نئے خیالات کو منضبط کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اردو شعر و شاعری اس کی محتاج ہے۔

لیکن اس مسئلہ میں ایک خطرہ کا ازالہ ضروری ہے جن خیالات کا اظہار کیا گیا۔

ہے ان سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ راقم الحروف آج کل کی بعض بدعات ادبی کا موید ہے ۔ اس میں شک نہیں اندنوں اُردو میں عجب عجب اقسام کے الفاظ اور ترکیبیں یا ان دونوں کا عجیب الخلقت مجموعہ رواج پزیر ہے جس نظریہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ۔ اگر اس کے ماتحت یہ ذخیرہ اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ فرض بد مذاق اور بد سلیقہ اُردو دانوں نے اپنے حصّہ میں لے لیا ہے اور یہ خطرہ سے خالی نہیں ہے چنانچہ اسکی روک تھام کی بھی کوشش کی جا رہی ہے ۔ جس کے سبب سے بعض حلقوں میں ایک طرح کی "ادبی ملّاحی" شروع ہو گئی ہے اور جو زیادہ تکلیف دہ اور نقصان رساں ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس وقت اُردو شعر کے سامنے دنیا کی مختلف زبانوں کے بہتر اور نادر نمونے نہیں ہیں ۔ فن تنقید یا شاعری پر اردو میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو موجودہ دور کے مطالبات پر حاوی ہو اور مستقبل ادب کے لئے صحیح جادہ کی طرف رہبری کر سکے ۔ اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اُردو شعر و شاعری کے سامنے جو نمونہ ہے یا رہا ہے وہ غلط ہے ۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ پاکیزہ اور حقیقت آشنا تخیل جس کی جولان گاہ بے انتہا وسیع ہے اور جس کے حریم ادب میں صرف شاعری کو اذن باریابی مل سکتا ہے اس پر حاوی ہونے کے لئے ضرورت یہ ہے کہ جو لوگ جہاں کہیں اور جس کسی زمانہ میں ہیں یا رہے ہوں اور جن منزلوں کو وہ جس طور پر عبور کر چکے ہیں وہ سب ہمارے پیش نظر ہوں اسلئے

HaSnain Sialvi



نہیں کہ ان کی کورانہ تقلید کی جائے بلکہ اس لئے کہ ان کے مساعی اور تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ بقولِ غالب ؎

خارہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت　　　　منتے بر قدمِ راہرواں است مرا

جہاں تک ممکن ہو سکے ہم کو ان نکتوں پر خلوص اور ہمدردی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے جو قدما کی تکمیل میں معین ہوئے ہوں جن کے ترک یا قبول سے ان مشاہیر نے علم و فن کو زندہ کیا اور معراجِ کمال تک پہونچایا۔ مگر ان حدود سے آگے بڑھنا ٹھیک نہیں ورنہ شخص پرستی ممکن ہے کہ جدید ترقیات کا سدباب کردے۔

شاعری کو حقیقت اور "انسانیت" کا ترجمان ہونا چاہیئے نہ یہ کہ وہ کس زبان کس قوم کس ملک کس زمانہ اور کن روایات کی ترجمانی ہے۔ شعراءِ اردو کے سامنے میر غالب، انیس، حالی، اکبر یا اقبال، حسرت، اصغر، فانی و جلیل نہ ہونے چاہئیں بلکہ اُن کے سامنے الوہیت کے وہ اسرار ہونے چاہئیں جن سے انسانی ہستی مرکب ہے جن کے دریافت یا اظہار کرنے کی آرزو شرف انسانیت و معیار ترقی ہے اور جن کا حصول انسانی زندگی کا مقدس نصب العین ہے۔ بالفاظِ دیگر اُن کے سامنے شعرا کے دواوین کے بجائے صحیفۂ فطرت ہونا چاہیئے الفاظ اور فقروں کی ترتیب کے بجائے اُن کو واقعات اور حالات کی ترتیب پر نظر رکھنی چاہیئے، محاورہ اور روزمرّہ کے بجائے زمانہ کے نشیب و فراز اور تلازم حیات کے جزر و مد کو ملحوظ رکھنا چاہیئے، ردیف اور قافیہ سے

زیادہ خیالات اور جذبات کی موزونی پیشِ نظر ہو رقصِ ترکیب اور ترنمِ الفاظ کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ الفاظ و معانی میں باہم توازن بھی ہے یا نہیں۔ یہ نہیں تو پھر ممکن ہے واہ واہ کا خلعت و انعام حاصل ہو جائے لیکن دوام کا خلعت اور ہم صفیریٔ ملائک کا طغرائے امتیاز کہاں!

## شاعر

شعریت کیا ہے اور شاعری کس کو کہتے ہیں ان کے متعلق راقم الحروف کے جو مخصوص خیالات تھے وہ پیش کر دیئے گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں کا حامل جس کو عرفِ عام میں شاعر کہتے ہیں کون ہے اور کیوں ہے۔ شاعر وہ ہے جو حقیقت کو برافگندہ نقاب کرنے میں بیک وقت صداقت، جرأت اور صناعت کو بروئے کار لا سکتا ہو، وہ حقیقت سے آشنا ہونے اور روشناس کرانے کے لیے تخمین تشنیع سزا و جزا، زمان و مکان کی پرواز کرے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ حقیقت کی مصوری کرے اور کمال یہ ہے کہ دیکھنے اور سننے والے بلا لحاظِ مدارج اس حقیقت کو اس طرح دیکھیں اور سنیں کہ دنیا کی سب سے پہلی ہستی، جس نے ان کو حقیقت آشنا کیا وہ شاعر اور صرف شاعر تھی۔ صداقت کا مفہوم یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہے وہ حقیقت پر مبنی ہو عینِ فطرت ہو یا قرینِ قیاس عقیدہ ہو۔ جرأت یہ کہ وہ بے لاگ کہے اور بے باک رہے، صناعت اس کو کہتے ہیں کہ جو کچھ کہے اس انداز سے کہے کہ اس سے سننے والے پر اثر پڑے اور معلوم ہو کہ یہ بات صرف اسی طور پر کہے جانے کی تھی

شاعری کو ایک فن بنایا گیا ہے اور محض اس بنا پر کہ اس میں شاعر اپنے تاثرات کو مقررہ اصول کے ماتحت اپنے مخصوص انداز سے ترتیب دیتا ہے۔ بظاہر اس امر کا اظہار بالکل معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن اسی حقیقت کو نظر انداز کر دینے سے اکثر کے شاعر اور ان کا کلام دونوں مسخ ہو گئے ہیں بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ محض مقررہ اصول کے ماتحت خیالات کو موزوں کر دینا شاعری ہے۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ محض الفاظ اور جملوں کو مقررہ اوزان میں ترتیب دیدینا شاعری ہے۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ دل میں جو خیال آئے اس کو من و عن بیان کر دینا شاعری ہے ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ترتیب خیال یا کلام میں اپنے انفرادی اور مخصوص جذبیت کو دخل کرنا ضروری سمجھتا ہو۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے بعض لوگوں کے چہرہ پر نظر کیجئے فرداً فرداً آنکھ، ناک، کان لب و دہن خوبصورت نظر آئیں گے۔ لیکن ان کے مجموعہ پر نظر کیجئے تو مایوسی ہوگی۔ دوسری طرف ایسے لوگ ہیں جن کے اعضا فرداً فرداً بالکل جاذب نظر نہ ہوں گے لیکن ان کا مجموعہ دلکش نظر آئے گا شاعری میں یہ معاملہ اور دلچسپ ہو جاتا ہے بعض کے کلام کو آپ فن کے اعتبار سے بالکل نپا تلا پائیں گے لیکن کیف کے اعتبار سے صفر محض، بعضوں کے ہاں نہایت اچھے الفاظ اور چست بندشیں نظر آئیں گی، لیکن بحیثیت مجموعی شعر بالکل بے نمک ہوگا۔ چند ایسے بدقسمت بھی ملیں گے جن کا کلام فن کے اعتبار سے بھی بالکل مکمل ہوگا، انتخاب الفاظ

اور بندش بھی موزوں و مناسب ہوگی بحر بھی مترنم ہوگی لیکن کیف عنقا۔

پہلی اور دوسری جماعت کے لوگ تو مسلمہ طور پر لکیر کے فقیر ہیں ان کے متعلق کچھ بھی کہنا بے کار ہے ان کا کلام رائے سینا دہلی کی سرکاری عمارات ہیں جو اس درجہ یکساں اور "سپاٹ" واقع ہوئے ہیں کہ ان کی امتیازی خصوصیت صرف ان کی کثرتِ تعداد ہے، عمارات کے اینٹ پتھر اور بنیاد وغیرہ میں کوئی نقص نہیں نکالا جاسکتا، حفظانِ صحت کے اعتبار سے بھی بے داغ ہیں مکان و مکین میں بھی تناسب ہے لیکن صناعت، جدت، تنوع اور نوک پلک کی تلاش مقصود ہو تو پھر آپ کسی ہندوستانی نوشہ کی ہیئت کذائی کا کیوں نہ مطالعہ کریں جو آج بیسویں صدی عیسوی میں بھی علی گڑھ ڈائننگ ہال کا کھانا بنا ہوا ہے۔

**آرٹ!!** تیسری جماعت یہ سمجھتی ہے کہ جو کچھ دل میں آئے وہ زبان پر نہ آسکے تو نہ آسکے اپنے صفحۂ قرطاس پر ضرور آجانا چاہیے، یہی کمال انشا پردازی ہے جس میں تغیر و تبدل کرنے سے آرٹ کا خون ہوتا ہے۔ ان بزرگوں کے نزدیک ان کی ہر لغزش یا برہنگی کا جواز آرٹ میں مل سکتا ہے۔ ان کے نزدیک دو اور دو چار کہنا بھی آرٹ ہے اور دو اور دو چار سو کہنا بھی آرٹ ہے اپنی کمزوریاں بھی آرٹ ہیں اور دوسروں کی خوبیاں بھی آرٹ، غرضیکہ آپ کسی بھی بے تکے پن کو، آرٹ بنا سکتے ہیں بشرطیکہ آپ اپنے زبان و قلم لب و لہجہ، صورت و شکل یا قول و فعل کو، علم الرغم، تعزیرات ہند یا اڈیٹر صاحب تیج بہ سرکار لا سکیں بالفاظ دیگر نفس نفیس

HaSnain Sialvi



آرٹ بن جائیں!

ان دنوں آرٹ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک نا اہل نے اپنی نظم و نثر میں غلو اضداد یا بیحیائی کو کہاں تک دخل دیا۔ آرٹ کے اس مفہوم نے سخت گمراہی پھیلا رکھی ہے اردو ادب میں اس وقت جو فرسودگی یا ابتذال نظر آرہا ہے اس کا راز آرٹ کے علمبرداروں کی حیاسوز دیدہ دلیری میں مل سکتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہمارے ذہن، زبان، قلم، یا کسی اور مصنوعی آلہ سے جو کچھ برآمد ہو وہ عین فطرت ہو اور یہی آرٹ ہے لیکن یہ لوگ کبھی یہ نہیں خیال کرتے کہ جس چیز کو ہم عین فطرت کہتے ہیں یا جس کو ہم عین فطرت بنانا یا بتانا چاہتے ہیں وہ وہ نہیں ہے جو خود بخود دفعتہً بغیر کسی کدو کاوش کے بلائے ناگہانی کی طرح سامنے آجائے یا کسی نا اہل کی خوش قسمتی ہو جو مرگِ بے ہنگام کی مانند نازل ہوتی ہے۔ فطرت کو صرف "نقشبندِ فطرت" بیک اشارہ کن پیدا یا بیدار کرسکتا ہے انسان خود مصنوع ہے اس لئے تخلیق فطرت اس کے لئے آسان نہیں ہے۔ وہ صرف "تطبیق فطرت" کرسکتا ہے۔ ہمارے ذہن و دماغ میں جو باتیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کو ہم کسی طور پر بتانا یا ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ بحیثیت اس کے کہ ان کو فطرت نے ذہن و دماغ میں پیدا و مقید کیا ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں انہیں چیزوں کو جب ہم عالم میں منتقل کریں گے تو ایک جداگانہ اور بسا اوقات بالکل مختلف حیثیت دینی پڑے گی ہم جو کچھ سوچتے سمجھتے یا محسوس کرتے ہیں اس کا اظہار اور وہ بھی اس طور پر کہ دوسرے بھی اسے

محسوس کرسکیں اور اس سے صحیح طور پر متاثر ہوسکیں اس درجہ مشکل (بلکہ ناممکن) ہے کہ ہم سوا اس کے تشبیہ استعارہ یا اشارہ وکنایہ سے کام لیں اور کچھ نہیں کرسکتے"! تشبیہ و استعارہ کی بنیاد ہی اسی حقیقت پر ہے۔

انسان کی ترقی کا معیار یہ ہے کہ اس نے اپنے جذبات یا میلانات کو اپنے اقوال و افعال میں منتقل کرنے سے پہلے کہاں تک جانچا اور پرکھا اور ان کی تراش و خراش و تہذیب و ترتیب میں کہاں تک کوشش کی اور کامیاب ہوا اسی طور پر دل میں مختلف قسم کے خیالات آتے ہیں لیکن ان کے ظاہر کرنے کا جواز صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ذہن و دماغ میں پیدا ہوئے بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ کب کس طور پر اور کتنی کمی بیشی کے ساتھ ظاہر کئے جائیں کہ حق ترجمانی بھی ادا ہوجائے اور بدمذاقی کا الزام بھی عائد نہ ہو۔ آج کل کے لکھنے والے خیالات کے پیدا ہونے، سوچنے اور ان کے اظہار میں کوئی وقفہ دینا پسند نہیں کرتے اور یہی ان کی اور اردو ادب کی محرومی ہے۔ خیالات کی افزائش اور ان کے قلمبند کئے جانے کے درمیان ایک وقفہ ہوتا ہے جس میں خود نفسِ خیال کے ترک و قبول اور اس کے طریقۂ اظہار پر غور کیا جاتا ہے یہی وہ ساعت ہوتی ہے جس کو نظر انداز کرنے یا نہ کرنے سے لکھنے والا ہمیشہ کے لئے بدنام یا نیک نام ہوجاتا ہے، رہ نوردانِ ادب کے لئے یہی منزل عالمِ برزخ ہے جس سے مفر نہیں۔

اس توضیح کے بعد آرٹ کی تعریف یہ رہ جاتی ہے کہ انسان کا ہر وہ کام آرٹ میں داخل ہے جو قوتِ فکر و فیصلہ دونوں کے صحیح استعمال کے بعد اس طرح پر پورا کیا جائے جس کے سوا اس کے انجام کا کوئی دوسرا طریقہ یا تو ممکن نہیں یا وہ کام دوسرے طریقہ پر کئے جانے کے قابل نہیں تھا۔ گویا اس مقصد کی تکمیل اسی خاص انداز میں کرنا خود منشائے فطرت تھا۔ یہاں معلوم ہوگا کہ آرٹ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انسانی پرواز کو فطرت "تکوین" سے کہاں تک ہم آہنگ ہونا چاہیئے اور یہ منصب کتنا بلند کتنا مشکل اور کن ذمہ داریوں کا حامل ہے۔

شاعر کا آرٹسٹ ہونا لازمی ہے اور آرٹ فی نفسہ صرف شعریت کا دوسرا نام ہے بعضوں کا خیال ہے کہ آرٹ یا شعریت صرف فنونِ لطیفہ تک محدود ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے اوپر کے بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ شعریت کا اطلاق انسان کے ہر فعل پر ہو سکتا ہے اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کس طور پر شعریت کو قائم رکھ کر مختلف قسم کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے اور اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے کہ آج کل کے نام نہاد شاعر جب کبھی کسی مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو یہ نہیں دیکھتے کہ اس مسئلہ کی نوعیت "دنیائے انسانیت" یا کائنات میں کیا ہے، بالفاظِ دیگر تقدیر الٰہی کیا ہے وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس پر مختلف لوگوں نے کس طور پر اظہارِ خیال کیا ہے کون کون سے الفاظ اسکے لئے موزوں یا مخصوص ہیں

اور قافیہ و ردیف کی پابندیاں کیا ہیں وہ صرف ان امور کو پیشِ نظر رکھ کر شعر ترتیب دیتا ہے بلکہ اصلیت تو یوں ہے کہ اُردو کے غزل گو حضرات ایک مصرعہ طرح کا لیتے ہیں اور سب سے پہلے قافیے سوچتے ہیں۔ اس قافیہ کی چقماق کو ٹھوس (یا ٹھس) دماغ سے ٹکرانے کے بعد جو بو یا چنگاری (یا دونوں) برآمد ہوتی ہے وہ مصرعۂ ثانی قرار دے دی جاتی ہے اور اسی میں مصرعۂ اولیٰ چپکا دیا جاتا ہے اب وہ صحیح طور پر چپکا بھی یا نہیں اس کو مشاعرہ کی واہ واہ والوں سے پوچھئے۔

بعض جلیل القدر ارباب فکر نے شعرا کو ایک طور پر پیغمبری کا درجہ دیا ہے دوسروں نے اس کو مستقبل کا واضع قانون گردانا ہے، کچھ اس کو رموز کائنات کا مفسر قرار دیتے ہیں، اس کی یہ ساری برگزیدگی محض اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ ہر چیز کا مطالعہ یا مشاہدہ خود اپنی آنکھ اور دل و دماغ سے کرتا ہے۔ وہ مستعار آلات اور خیالات کو ہمیشہ مسترد کر دیتا ہے وہ اپنی تعلیم کو دلائل اور براہین سے نہیں منواتا کیونکہ یہ شاعر کے عقیدہ میں دلیل و برہان مقدمہ و نتیجہ کی کڑی ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ایک شے "غیر جنس" ہے۔ البتہ بندہ اور خداوند کے درمیان جو واسطہ لاہوتی ہے اس کو ایک روحانی سرود سے بیدار کر دینا اور روحِ انسانی کو مبداءِ فیض سے جو حقیقی مگر لطیف طلّی نسبت ہے اس کو ایک نوائے رنگین سے مرتعش و مشتعل کر دینا اس کا مقصد حیات ہے۔ شاعر کی زبان سے عالمِ بیخودی میں ایک ترانہ نکل جاتا ہے جو سامعہ سے دماغ تک پہنچکر ہم کو وارفتۂ ہستی کر دیتا

ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم اپنے دامنِ خیال سے کثافتِ عنصری کا غبار جھاڑ کر اس خاکدان آب و گل کی ناسوتی پستی سے بلند ہو جاتے ہیں اور اس عالم میں جا پہونچتے ہیں جہاں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا خدا اور اس کی ساری کائنات اور ہم خود صرف ایک دلکش ترانے اور ایک لطیف حقیقت میں گم ہو گئے ہیں جہاں کوئی خالق ہے اور نہ کوئی مخلوق جہاں نہ جبر ہے نہ اختیار نہ سزا ہے نہ جزا، جہاں وہ سب کچھ ہے جو ہم چاہتے ہیں لیکن کسی طور پر ظاہر نہیں کر سکتے، جس کی لطافت تاب اظہار نہیں لا سکتی جس کی رنگ آرائیوں کو حسِ نظر گوارا نہیں اور جس کا احساس ایک ایسی نازک، لطیف اور روح پرور کیفیت ہے جو اپنے علم کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی، اصغر نے کیا خوب کہا ہے ؎

مضراب محبت سے ایک نغمۂ لاہوتی — پھر جوشِ ترنم سے بیتاب رگِ جاں ہے

اس سلسلہ میں ایک آخری سوال یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ ہمارے موجودہ شعرا اس انفرادیت کو کس طور پر بر سرِ کار لا سکتے ہیں اور اس کی ابتدا کن ضوابط کے ماتحت ہونی چاہیئے، یا بالفاظِ دیگر ہماری انشا پردازی کا مدار الفاظ پر ہوگا یا معانی پر۔ اس سوال کا آسان اور محفوظ ترین جواب ایک تو وہ ہے جو "جبر الا مور" کے سلسلہ میں دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک خیالات اور معانی کا تعلق ہے ہمارا سرمایہ کافی محدود ہو چکا ہے اور اس میں وسعت کی بہت کم گنجائش رہ گئی ہے۔ دنیا میں "حقائق" یا "واقعات" پیدا نہیں کئے جاتے، یہ صرف دریافت

کئے جاتے ہیں ادب و شاعری میں "تناسخ" کا اصول کارفرما رہتا ہے جس طور پر
ایک جماعت کے عقیدہ کے مطابق ایک ہی "روح" مختلف اجسام میں جلوہ فرما
ہوا کرتی ہے اسی طور پر ایک ہی حقیقت مختلف ازمنہ و السنہ میں مختلف الفاظ
اور مختلف انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اس لئے جہاں تک روح کا تعلق ہے ہمارا
کوئی بس نہیں چل سکتا البتہ اس کا تزکیہ ہم مختلف طریقوں سے کر سکتے ہیں وہ
بھی اس طور پر کہ ہم اپنی محنت و ریاضت سے اس کی اصلاح و تہذیب میں مصروف
رہیں۔ اسی طرح جہاں تک انشا پردازی کا تعلق ہے اب صرف ایک چیز
رہ گئی ہے جس پر اس فن کے لیے پایاں امکانات کا مدار ہے اور وہ اسلوب
بیان ہے یعنی خیالات کی مختلف ترتیب مختلف استعارات و تشبیہات کا
بر محل استعمال، کلام میں ایسی روانی اور برجستگی پیدا کرنا جس سے الفاظ بے جان
نقوش نہ معلوم ہوں بلکہ جذبات کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئیں۔ خیالات
کو اس انداز سے پیش کرنا اور ایسے پیرایہ میں پیش کرنا کہ وہ دلکش اور
دلنشین ہو جائیں۔ بالفاظ دیگر گویا ان خیالات کو صرف اسی طور پر ادا کیا
جا سکتا تھا اور کوئی دوسری صورت مناسب یا ممکن نہ تھی۔ اشعار کو ایک
قسم کا ڈراما بنا دینا چاہیئے جس میں الفاظ بمنزلہ ایکٹر ہوں ان کی ترتیب ڈرامے
کا پلاٹ ہو، ان کا ترنم ڈرامے کی موسیقی ہو، ان کا اتار چڑھاؤ اسٹیج کے نغمہ
و سرود کی ہم آہنگی ہو وغیرہ وغیرہ۔ اس کا نام کمال شاعری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ادب اردو میں اصلاح کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور کہیں کہیں جدت و اختراع کے آثار بھی نظر آتے ہیں لیکن یہاں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ وہ جادہ فرسودہ سے گریز کرنا بہرحال بہتر ہے مگر یہ گریز کبھی کبھی گمراہی کی صورت بھی اختیار کرلیتا ہے، مثلاً آج کل اردو شاعری کا سب سے بڑا نقص یہ قرار دیا جاتا ہے کہ اس میں ردیف قافیہ اور اس قسم کی دیگر پابندیاں ایسی ہیں جو شاعر کے قدم قدم پر حائل ہوتی ہیں اس لئے ان سے بغاوت کرنی لازم ہے۔ چنانچہ بغاوت شروع بھی کردی گئی ہے لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے ان باغیوں کا کارنامہ محض خودسری طوائف الملوکی یا "ہڑبونگ" ہے اب تک انہوں نے کوئی نظام نہیں قائم کیا ہے، اور جو کچھ کیا بھی ہے اس میں کجروی کا رنگ غالب ہے، ظاہر ہے کہ بیچارہ باغی خود کبھی اپنی بغاوت سے فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ اس کے بعد کی نسلیں اس کی بغاوت سے متمتع ہوتی ہیں، خدا کرے ایسا ہو لیکن ستم تو یہ ہے کہ یہ باغی خود اپنا کوئی سرمایہ نہیں رکھتے بلکہ قدیم دور استبداد کے خلاف جن بہادر مشروطہ خواہوں نے کامیاب جہاد کیا ہے انہیں کے اسلحہ کا غلط استعمال یا ان کی کورانہ تقلید، ان کا کارنامہ ہے۔ جس طرح ترک موالات کے دور آخر میں جہلا کا ایک طبقہ "گاندھی کی جے" لگا کر ڈاکہ زنی کو جہاد حریت اور سوراج کو مہابھارت سمجھتا تھا ٹھیک اسی طرح حالی، اکبر اور اقبال کا نام لے کر آجکل

کے منچلے ہر صدائے بے ہنگام کو جدت طرازی سمجھتے ہیں ؎

کچھ ایسے بھی ہیں جو اصلاح کے جوش میں
کشتیٔ خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

کا نعرہ لگا کر ساحل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں ۔ انہوں نے تو کشتی خدا پہ چھوڑ دی ہے دیکھئے خدا اسے کس پر چھوڑتا ہے!


آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

محمد ثاقب ریاض: 03447227224
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

۸۶

# کلامِ فانی پر ایک نظر

## باب دوم

لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے / کیوں اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل

شعریت، شاعری اور شاعروں کے متعلق اب تک جو کچھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اسکے تحت میں جب ہم فانی کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فانی کے خیالات اسالیب بیان اور ذوق امتیاز دوسرے شعرا کے مقابلہ میں ایک نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔ دیگر شعرا کے کلام کے خلاف فانی کے کلام میں جو حقیقت سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ان کا مخصوص انفرادی رنگ ہے جس میں غالب کی دشوار پسندی دقت نظر اور فلسفہ نگاری کے باوجود غالب کے امتیاز خصوصی یعنی فارسی کے نامانوس محاورے ثقیل ترکیبیں اور عربی کے لغات غریبہ بالکل ناپید ہیں۔ دیوان غالب اور افکار فانی دونوں کو مقابل رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک لطافت زبان اور نزاکت بیان کا تعلق ہے، دونوں میں وہی بُعد ہے جو فلسفہ ارتقا کی بنا پر تاریخی حیثیت سے دونوں میں ہونا چاہیئے، بایں ہمہ زندگی کے نو بنو وسیع اور عمیق

اسرار کو بے نقاب کرنے میں دونوں تقریباً مساوی طور پر کامیاب ہوئے ہیں اس میں شک نہیں بعض خیالات فی نفسہ ایسے ہوتے ہیں جن کا اظہار صرف مشکل اور بسا اوقات صرف غیر مانوس الفاظ و تراکیب سے کیا جا سکتا ہے اور یہی سبب ہے کہ غالب کو اپنا جادۂ خیال الگ کرنے کے لئے مجبوراً شاہ راہ عام سے ہٹ کر وہ انداز بیان اختیار کرنا پڑا جس سے اُس وقت تک اردو اور اردو داں دونوں ناآشنا تھے لیکن فانی نے بعض انہی خیالات کی ایسی عام فہم طریقہ پر ترجمانی کی ہے کہ ہم کو انکے شاعرانہ اور ادیبانہ کمال کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ چونکہ غالب اس کے مجدد تھے ان کو ایک "سخندان" مخاطب کی ضرورت محسوس ہوئی اور "بے مہریٔ یاران وطن" کی شکایت کرنی پڑی فانی ان کے بعد آئے اسلئے ان کو اس قسم کی دشواریاں پیش نہیں آئیں۔ موجودہ دور میں مختلف علوم و فنون کے سیکھنے اور برتنے سے شاعر اور اس کے مخاطب دونوں ایک دوسرے سے کم و بیش مانوس ہو چکے ہیں اس لئے پچھلے دقتوں کا اندیشہ تقریباً ناممکن ہے اس اعتبار سے غالب کا مقابلہ ایک حد تک اقبال سے کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کی شعر و شاعری پر جو "شور طوفان خیز" اُٹھا اس کا راز بھی اسی حقیقت میں مضمر تھا کہ وہ یک لخت ایسے خیالات اور ایسے اسالیب بیان کے ساتھ بیدار ہوئے کہ ان کے مخاطب ان کے ہمدوش نہ رہ سکے، بمصداق ؎

آں نیست کہ من ہمنفساں را بگذارم　　با بلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز است

غالبؔ کی مانند فانیؔ کو بھی مجردات سے بحث کرنے کا خاص ذوق اور اس کے اظہار پر غیر معمولی قدرت ہے ان کو دقیق سے دقیق مسئلہ کی تشریح و تفسیر کے لئے بھی غیر مانوس یا دقیق الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی ان کو غالبؔ کے مقابلہ میں ایک امتیازی حیثیت دی جا سکتی ہے مگر بہرحال۔

## الفضل للمتقدم

علاوہ بریں وہ غالبؔ کی مانند "متنوع" نہیں ہیں یعنی اُنہوں نے غالبؔ کی طرح زندگی کے ہر پہلو کا ہر نقطہ نگاہ سے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ فانیؔ "یاسیات" کے تخلیقی فلسفہ میں ید طولےٰ رکھتے ہیں۔ غالبؔ کے ہاں بقول بجنوری مرحوم کون سا نغمہ ہے جو اس ساز میں موجود نہیں ہے۔ بہرحال سلف و خلف میں جو باہمی نسبت ہے اس کو واضح کرنے کے لئے ذیل میں دونوں کے چند قریب المعنی اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے (غالبؔ)
ہر مژدۂ نگار غلط، جلوہ خود فریب — عالم دلیل گرمیٔ چشم و گوش تھا (فانیؔ)

---

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں (غالبؔ)
تجلیات ہم ہیں مشاہدات آب و گل — کرشمۂ حیات ہے خیال، وہ بھی خواب کا (فانیؔ)

---

اشعار بالا پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بلوجود اس کے کہ دونوں نے زندگی کے مفہوم پر اظہار خیال کرنے میں مجردات ہی کو ملحوظ رکھا ہے فانی نے ساتھ ہی ساتھ ایسے الفاظ اور ترکیبوں کو دخل دیا ہے جن کا مجموعی اثر سامع کی اور اک و بصیرت کو شگفتہ کر دیتا ہے اور نفس مطلب کے سمجھنے میں آسانی ہی نہیں بلکہ ایک طرح کی شگفتگی بھی محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے دو اشعار غور طلب ہیں غالب کا ایک شعر مخاطب کا محتاج ہے (خواہ وہ اسد ہی کیوں نہ ہوں) انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تنبیہہ یا نصیحت کر رہے ہیں، سامع محسوس کرتا ہے کہ ایک شخص کو ہدایت کر رہا ہے اور وہ شخص بھی محض ایک شاعر نہیں بلکہ "مبلغ" یا "واعظ" بھی ہے۔ تسلیم ہے کہ یہ انداز تخاطب کسی مخصوص مخاطب کا محتاج نہیں ہے بلکہ یہ ایک حیثیت سے نہایت معنی خیز اور دلکش بھی تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس کا موازنہ ایک دوسرے طرز بیان سے کیا جاتا ہے جہاں کسی کمزور پہلو کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ اس وقت یہ امتیاز نمایاں اور قابل ذکر ہو جاتا ہے فانی کا انداز بالکل بے لوث ہے اور اس لئے سزاوار ستائش۔ وہ اپنا تجربہ بتلاتے ہیں انکی آواز ایک طور پر غیب کی آواز ہے جس کے محض اشارات ہوتے ہیں، اس کے علاوہ فانی نے اپنا مفہوم واضح کرنے کے لئے اپنے دلائل کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے غالب نے تو صرف یہ کہا ہے۔

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

معانی کے لحاظ سے بھی غالب کا شعر اگر ایک طرف عالمِ محسوسات کے موجودات مادی کی نفی کرتا ہے تو دوسری جانب "حلقۂ دامِ خیال" کہہ کر ایک دوسرے نظریہ کا ادعا بھی کر دیا ہے جو خود محتاجِ ثبوت ہے، البتہ اس مصرعہ کی داد بر کلے اور اس کی متبعین دے سکتے ہیں۔ آخر خود خیال کا وجود حقیقی کیوں مان لیا جائے اس کے مقابلہ میں فانی صرف محسوسات کے وجود کا انکار اور حواسِ خمسہ ظاہری کی فریب کاریوں کا اعتراف کرنا کافی سمجھتے ہیں اور خود کسی دعوے بے دلیل کو پیش کرنے کی ذمہ داری نہیں لیتے۔ عالم کو "حلقۂ دامِ خیال" کے بجائے "دلیل گمرہیٔ چشم و گوش" بتانا صحیح فلسفیت کے علاوہ کس قدر دل کش اور شاعرانہ انداز بیان ہے۔

دوسرے دو اشعار پر یوں بحث کرنا زیادہ آسان ہوگا کہ ہم دونوں شاعروں کے پہلے دو مصرعوں کو ساتھ لیں اس کے بعد دونوں کے ثانی مصرعوں پر غور کریں ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود (غالب)
تجلیات وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل (فانی)

غالب کے مصرعہ کو سمجھنے کے لئے گلشن راز اور لوائح جامی کا مطالعہ بھی ایک حد تک لازمی ہے، یہ خیالات ان الفاظ میں اور اس ترکیب کے ساتھ صرف محمود شبستری اور ملا جامی علیہ الرحمتہ کے زبان و قلم سے ادا ہوتے تو زیادہ

موزوں ہوتا ہے آہیات کا جز تفعیل کیوں نہ کہئے دوسرے فانی کے مصرع کو لیجئے وہ کہتے ہیں کہ انسانی مشاہدات محض اس پیکر آب و گل کے توہمات کی رنگ آرائی ہے اس کی صفائی زبان، شگفتگی، ترکیب و معنویت کے لحاظ سے فانی کا مصرع نہایت دل کش ہے، فانی نے صرف جزے کل کا استنباط کیا ہے۔ اور انتخاب الفاظ میں تصوف نہیں بلکہ شعریت کو ملحوظ رکھا ہے۔ غالب کی مانند انہوں نے بھی "خواب" و "خیال" ہی پر زور دیا ہے لیکن اپنے فرض سے غافل نہیں ہوئے ہیں۔ فانی نے شاعر ہونے کی حیثیت سے محض ایسی چیز کا انتخاب کیا ہے جس پر شاعری کا عمل آسانی کے ساتھ چل سکے۔ وہ آب و گل کی تخصیص کر کے مصرعہ میں ایک طور کی روح، یا زندگی، پیدا کرتے ہیں اور پھر اُن کو "تجلیات وہم" سے وابستہ کر کے انتہائے شعریت، کو راہ دے کر شعر میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اب ثانی مصرعہ کو لیجئے غالب کے مصرعہ میں صرف خواب ہی خواب نظر آتا ہے۔ وہ کسی "کرشمہ حیات" کا تذکرہ نہیں کرتے اس لئے سامع کا ذہن سہولیت کے ساتھ اس کی اصلیت کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ فانی نے پہلے مصرعہ میں توہم، کی کار فرمائی دکھائی ہے اور اس کا ایک حد تک شاعرانہ تجزیہ کیا ہے ثانی مصرعہ میں وہ زندگی کی مختلف کرشمہ سازیوں کی طرف مائل ہوتے ہیں اور ایک ایسی حالت کا تذکرہ کر کے جو ہم سب پر گذر لی ہے اور جس سے ہم سب آشنا ہیں یعنی رزم حیات کے مختلف کارنامے (بقول فانی، کرشمۂ حیات) غالب

ہی کی دنیا میں ہم کو داخل کر دیتے ہیں۔ فانی نے خیال کے ساتھ جو قید بڑھا دی ہے کہ "وہ بھی خواب کا" یہ اس سے زیادہ لطیف پیرایہ ہے جو غالب نے اختیار کیا ہے کہ "ہیں خواب میں ہنوز..... الخ"

فانی نے ایک جگہ اسی خیال کو کس شاعرانہ بے تکلفی سے ادا کیا ہے ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

غالب کا ایک شعر ہے ؎

ہاں کھائیو مت فریب ہستی　　ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

فانی نے کہا ہے ؎

ہے کہ فانی نہیں ہے کیا کہیے　　راز ہے بے نیاز محرم راز

غالب کا بیان قطعی ہے اور اگر آخری ٹکڑے میں حسن بیان کی دلکشی نہ موجود ہوتی تو یہ قطعیت کانوں کو بھلی نہ معلوم ہوتی لیکن بے ساختگی نے اس میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کر دیا ہے۔ فانی ایک بڑی حد تک غالب کے ہمزبان ہیں لیکن ان کا "تشکک" غالب کی "قطعیت" سے کہیں زیادہ خوشگوار اور خوش آیند معلوم ہوتا ہے۔ فانی کے دوسرے مصرعہ نے ایک ناقابل تشریح، مشکوک اور دشوار مفہوم کو اس خوشگوار انداز میں بیان کیا ہے کہ اس سے ہم متاثر بھی ہوتے ہیں اور مسرور بھی، غالب اور فانی کے ثانی مصرعوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غالب کے ہاں نفی محض ہے اور شاعرانہ جدت کا بھی

پورا ثبوت نہیں ملتا فانی نے اسی خیال کو ادا کیا ہے لیکن "راز" کو "بے نیاز محرم راز" بنا کر اس میں شعریت اور حسن بیاں کا بہترین نمونہ پیش کر دیا ہے اس مبحث کے بعض نکتے آیندہ سطور میں آئیں گے۔

غالب کا ایک بے مثل شعر وحدت الوجود پر ہے ؎

نہ تھا جب کچھ خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ ہونے نے نہ ہوتا میں کیا ہوتا

اس "کیا ہوتا" کے اندر جو دنیائے معانی مضمر ہے اس کی تلاش اردو ادب میں تقریباً بے سود ہے، مگر اسی انداز بیان میں انسان کے احساس انانیت کا فلسفہ حضرت فانی نے کس لطافت سے ادا کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

مراد جود ہے میری نگاہِ خود نشناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا

ہماری ہستی اس قدر اعتباری اور ہمارا وجود اس درجہ بے حقیقت ہے کہ اس سے بے خبر ہی رہنے میں سلامتی ہے ورنہ جہاں ہم اپنی ہستی سے باخبر ہوئے اور اس ہستی موہوم اور نمود بے بود کا راز منکشف ہوا وہیں ہماری ساری انانیت فنا ہوئی۔ غالب نے اسی خیال کو ایک جگہ نہایت خوبی اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے جس کے عمق پر نظر کرنے سے اگر ایک طرف سر چکرانے لگتا ہے تو دوسری طرف اس کی نزاکت حباب کی مانند ہے جس کو

ہاتھ لگانا بھی اندیشہ سے خالی نہیں ہے، فرماتے ہیں ؎

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

میں، یعنی ہمارے اندر جو احساس "انا" ہے اگر درحقیقت "معرفت نفس" اور اپنی ادراک ہستی پر مبنی ہے تو یہ "انا" نہیں ہے بلکہ شکست انانیت کا اعتراف ہے اسی زمین میں فانی کا شعر قابل غور ہے۔ جس میں انسانی زندگی کا محض منفی پہلو دکھانے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس کا وہ روشن اور ایجابی پہلو دکھایا ہے جہاں یہ وجود ظلی عالم لاہوت کی فضائے ناپیدا کنار میں گم ہو کر کیا کچھ نہیں ہو جانا فرماتے ہیں ؎

ہوں، مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم　　میری ہستی ہے عیب کی آواز

حقیقت انسانی کے مافوق الادراک ہونے کا فلسفہ اس سے بہتر پیرایہ میں بمشکل ادا کیا جا سکتا ہے۔

بایں ہیئت یوں تو فانی کا حصہ ہے لیکن یہاں غالب کے شعر میں یہ رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے ہاں "میں" کو محض "شکست کی آواز" سے تعبیر کیا گیا ہے پہلے مصرعہ میں دونوں نے نفی کی ہے، ثانی میں دونوں نے اثبات کا پہلو اختیار کیا ہے دونوں اپنی اپنی ہستی کو "آواز" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر غالب کا جملہ مثبتہ بھی باعتبار معنی اثبات نفی ہے غالب اپنے کو شکست کی آواز بتاتے ہیں اس اعتبار سے اُن کا زاویہ نگاہ محض سلبی ہے لیکن اس حیثیت سے کہ وہ

شکست بھی ان کی اپنی ہی شکست ہے اس میں اب بھی ایک شان خود اداری مضمر ہے جس سے ایک گونہ ایجابی پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ فانی کا نظریہ اس سے مختلف ہے وہ محض اس لفظ موہوم اس قفس عنصری کو انسانی ہستی نہیں قرار دیتے، وہ اصل مبداء کے متلاشی ہیں اور اس ہستی کو غیب کی نامعلوم وسعت میں گم کر دیتے ہیں۔ غالب کا عقیدہ ہے۔ کہ جس کو "میں" کہتے ہیں وہ فی الحقیقت اصل انسان کی "دلیل فنا" یا "ترجمان فنا" ہے۔ غالب کا مفہوم تقریباً یہ ہے، میرا قطرہ وجود دریائے وجود حقیقی سے علیحدہ ہو کر معرض خطرہ و فنا میں پڑ گیا اور خود میرا علیحدہ موجود ہونا میرے فنا کا سبب ہوا جس طرح شیشہ ٹوٹتے وقت آواز دیتا ہے اور اس میں جھنکار پیدا ہوتی ہے تو وہ آواز اس کے وجود پر شہادت نہیں دیتی بلکہ اس کی فنا پر دلیل ہے۔ اس کے مقابلہ میں فانی کا نظریہ یہ ہے کہ ہر آواز کے لئے صاحب آواز ضروری ہے۔ اس لئے یہ "انا" بے حقیقت نہیں ہے البتہ اس کا سہارا کیا ہے؟ وہی بے آغاز و بایاں ہستی جس کی طرف انجیل مقدس نے اشارہ کیا ہے۔

"پہلے کلام تھا، کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خود خدا تھا"

انسان کو تعینات کی قیود سے آزاد کر دیا جائے تو پھر اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے، اسی خیال کو فانی نے ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

تعینات کی حد سے گذر رہی ہے نگاہ　　بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

قیود نے انسان کو اس کے اصل سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اس طور پر وہ حیثیت

جو اپنے قیود کے باعث انسان یا انسانی کہلاتی ہے اپنے تئیں یا غیب پر خود ایک دلیل ہے۔ فانی نے "امید آفرینی" (اوٹیمزم) کو زیادہ دخل دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری ہستی ایک "پیام غیب" ہے۔ غالب نے اپنے مصرعہ میں صرف نفی نفی پکارا ہے اس طور پر انہوں نے تخلیق و تکوین انسان کا کوئی مقصد ہی قائم نہیں رہنے دیا ہے۔ فانی کہتے ہیں کہ میرا وجود ایک نادیدہ لیکن ناگزیر ہستی کا بلند آہنگ پیغام ہے۔ اسی خیال کو ایک دوسرے مقام پر فانی نے اپنے مخصوص رنگ میں ادا کیا ہے اور گو یہاں نوعیت بیان میں غالب سے نزدیک ہو گئے ہیں اپنے عقیدہ کی رو سے ان سے بالکل علیحدہ ہیں، کہتے ہیں ؎

خطاب روز حشر کی صدائے بازگشت ہوں
جواب بے سوال ہوں سوال بے جواب کا

کلام الٰہی میں آیا ہے کہ ہنگامہ رستخیز حشر میں بارگاہ الوہیت کی جانب سے خطاب ہوگا لمن الملک الیوم اور جب تمام فضائے محشر اس صدائے جلال کا اعتراف سکوت عبودیت سے دیگی اور کسی طرف سے کوئی صدا نہ آئے گی تو خود جواب میں ارشاد ہوگا للہ الواحد القہار ؎

عالم ہستی نتیجہ "کن" ہے یا خود صدائے "کن" بہر حال اس کا مبدا و معاد وہی ذات واحد ہے۔ مظاہر کا وجود عدم اپنے ارادہ سے نہیں ہے بلکہ جمال پردہ نشین کی بیتاب شعاعیں اپنی کیشمہ سازی کا تماشا دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس نظریہ کی ترجمانی

کیا جاتا ہے) منتہا نہیں تصور کرتے۔ حشر میں اُنہوں نے معلوم نہیں کیا دیکھا سنا، یا محسوس کیا کہ اس سے ان پر ایک طرح کی سرنگونی اور شرمساری طاری ہوئی ممکن ہے یہ ان کی "روسیاہی" کی جقدر منز تھی یا عفو باری کی طغیانی یا فراوانی تھی یا کیا جس کی وجہ سے وہ زمین حشر میں "گڑ" "گئے"! اور اب اُن کو اٹھانے کے لئے ایک دوسرے حشر کی ضرورت ہے۔ اسی استعارہ میں فانی نے اک اور خیال کس قدر لطافت سے ادا کیا ہے ؎

حشر میں حشر چاہئے حشر پہ حشر چاہیئے
دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیۂ نیاز میں

غالب اور فانی کا موازنہ اب ان حدود سے گذرنے لگا ہے جس کو "مآل اندیشی" "محفوظ" قرار دے سکے اس لئے اب ہم دونوں کے صرف وہ اشعار پیش کرتے ہیں جو مفہوم کے اعتبار سے ملتے جلتے ہیں، ارباب نظر خود کسی نہ کسی "خاموش" فیصلہ پر پہنچ جائیں گے پہلے دو اشعار میں غالب کا پایہ بلند تر ہے ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں (غالب)

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں (فانی)

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں (غالب) ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو (فانی) پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

---

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب (غالب) ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے
یاں میرے قدم سے ہے ویرانے کی آبادی (فانی) واں گھر میں خدا رکھے آباد ہے ویرانی

---

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی (غالب) ہیولے برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا
تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق (فانی) جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

---

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام (غالب) ایک مرگِ ناگہانی اور ہے
اپنی تو ساری عمر ہی فانی گذار دی (فانی) اک مرگِ ناگہاں کے غمِ انتظار نے

---

اساتذہ میں سے غالب کے بعد جس کے اندازِ بیان کا رنگ فانی کی شاعری پر غالب ہے وہ میر ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میر کا سوز و گداز انکی لطافتِ زبان اور نزاکتِ ادا فانی کی شاعری کا اصلی جوہر ہے، البتہ متقدم و متاخر کا فرق ہے اس سلسلہ میں مقابلہ سے بہتر ہوگا کہ میر کے رنگ کے چند اشعار دیوانِ فانی سے منتخب کر کے ہدیۂ ناظرین کئے جائیں ؎

فانی کو یاجنوں ہے یا تیری آرزو ہے — کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رویا

نازکیا، ہاں اک دھواں سا شام ہجر  بستر بیمار سے اٹھا کیا

---

آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں  دل سے لپیٹ لپٹ کر غم بار بار رو دیا

---

نازک ہے آج شاید حالت مریض غم کی  کیا چارہ گر نے سمجھا کیوں بار بار رو دیا

---

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آ کے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

---

خو تماشا ہوں میں یا رب یا مدہوش تماشا ہوں
اس نے کب کا پھیر لیا منہ اب کس کا منہ تکتا ہوں

---

گو ہستی تھی خواب پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی
چونک اٹھتے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

---

آخری تین اشعار میں غفلت انسانی کا فلسفہ کس موثر پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ میر کا ایک لاجواب شعر ہے۔

اک موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی                شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

ایک عاشقِ زار آمدِ بہار کی تعبیر صرف دیوانگی و زنجیر سے کرتا ہے اور یہی اس شعر کا حُسن ہے، ایک جگہ فانیؔ نے "درِ زنداں" کا کھلنا بیان کیا ہے جس پر زیادہ تفصیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، دونوں اشعار اپنے اندر کیفیات کا میخانہ لئے ہوئے ہیں، فانی کہتے ہیں ؎

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

میرؔ کا ایک شعر (سہل ممتنع) ہے ؎

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

فانیؔ کہتے ہیں ؎

یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اس نے کہا کہئے
تو چُپ ہیں کہ کیا کہئے کھلتی ہے زباں کوئی

استاد مومن خاں مرحوم جہاں اُردو میں ندرتِ ادا اور خوبصورت فارسی ترکیبوں کے موجد ہیں وہاں ان کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ ان کی غزل کی جان ان کا مقطع ہوتا ہے، یہ خصوصیت فانیؔ کی شاعری کا بھی ایک نمایاں جوہر ہے، یہاں چند مقطعے بطور نمونے پیش کئے جاتے ہیں ۔

کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی فانیؔ
زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا

---

خاکِ فانیؔ کی قسم ہے تجھے اے دشتِ جنوں
کس سے سیکھا ترے ذروں نے بیاباں ہونا

---

چمن سے رخصتِ فانیؔ قریب ہے شاید
کچھ اب کی بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

---

کس کی کشتی تہِ گردابِ فنا جا پہونچی
شورِ لبیک جو فانیؔ لبِ ساحل سے اٹھا

---

آج روزِ وصالِ فانیؔ ہے موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

---

موازنہ درحقیقت کوئی صحیح طریقۂ تنقید نہیں ہے۔ نہ یہ ضروری ہے کہ ہر شخص ناقد کی رائے سے متفق ہو، مذاقِ طبائع اس قدر مختلف ہے کہ وہی شے ایک شخص پر عالمِ وجد طاری کر دیتی ہے مگر دوسرے کو حس تک نہیں

ہوتا۔ اس لئے محاکمہ نہایت دشوار ہونے کے علاوہ کبھی قطعی نہیں ہو سکتا۔ البتہ مختلف اساتذہ کے موازنہ کلام سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ بصورتِ توارد، شاعر کی شانِ انفرادیت اس کے کلام سے جلوہ گر ہوتی ہے یا بحالت تتبع خیالات انسانی میں جو تدریجی ترقی ہوتی ہے اس کا تاریخی سراغ لگتا ہے۔ اس لئے فانی اور ان کے معاصرین یا قدما کے چند ہمرنگ اشعار جو بلا تفحص اس موقعہ پر یاد آگئے ہیں، نذرِ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

(طالبِ آملی)

با صد کرشمہ آں بت بدست میبرد
خود میکند خرام و خود از دست میبرد

نشۂ حسن سے جو عالم بیخودی طاری ہوتا ہے اس شعر میں محض اس کی مصوری ہے۔

(سہیل)

وہ مستِ نازِ حسن، میں سرشارِ آرزو
وہ اختیار میں ہیں نہ میں اختیار میں

اس میں نشۂ حسن کے علاوہ وارفتگیٔ محبت کا عالم بیخبری بھی ہے۔

(فانی)

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

یہاں صرف مصرعۂ اول میں سہیل کا سارا مضمون آگیا اور مصرعۂ ثانی میں ایک ضروری خیال کا اضافہ کیا گیا ہے جو ان کے ہاں نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ حسن ہو یا عشق دونوں کا کمال بیخبری ہے لیکن یہ بےخبری خود اپنی ذات سے

ہوتی ہے، معشوق باایں ہمہ نیازی نشۂ حسن میں بھی نگاہِ مشتاق کا آرزو مند ہوتا ہے اور عشق تو بہر صورت حسن سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس کیفیت کو اس سے بہتر ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ؎

اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا!

عشق کی انتہائے آرزو یہ ہے کہ تیغِ حسن کا شہید ہو۔ جانبازانِ محبت شکوۂ قاتل نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ سربکف رہتے ہیں۔ عشق میں مرنے سے گھبرانا کمالِ بزدلی ہے لیکن اگر اسی بزدلی کو کمالِ عشق ثابت کیا جائے اور زندگیِ محبت کو خود بیزاریِ حیات بنا کر پیش کیا جائے تو یہ ندرت کی ایک بہتر مثال ہو گی سہیل کا ایک شعر یہاں یاد آگیا ؎

ہوں ننگِ زیست خواہشِ عمرِ ابد ہو خاک ڈرتا ہوں دستِ ناز میں تلوار دیکھ کر

یہ مسلمہ ہے کہ شہیدِ عشق کو حیاتِ جاوداں ملتی ہے لہٰذا مرنے کی تمنا حقیقت میں بہادری نہیں۔ بلکہ ایک طرح کی تجارت اور حیاتِ ابدی کی خواہش ہے اس لئے شاعر جو خود اس چند روزہ زندگی سے بیزار ہے وہ ابدی زندگی کی معیت سے ضرور گھبرائے گا۔ سہیل نے ایک جگہ کہا ہے ؎

رہا ہونے چلے تھے قیدِ ہستی سے خبر کیا تھی
کہ عمرِ جاوداں دے گا ہمیں ذوقِ فنا اپنا

اسی خیال کو فانی نے یوں ادا کیا ہے ؎

ہو غمِ ہستیِ جاوید گوارا کیوں کر　　جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم

ذیل میں، فانی اور سہیل دونوں نے بجلی کی شعاعوں سے تعمیرِ آشیاں کی ہے مگر دونوں کی انفرادیت کس درجہ نمایاں ہے ایک کے ہاں قصیدہ کا شکوہ اور بلند آہنگی تو دوسرے کے ہاں تغزل کی نزاکت اور حزن آفرینی ملاحظہ ہو،

(سہیل)

شعاعِ برقِ ایمن ہے، یہاں ہر خس نشیمن کا
جلا دے جس کو بجلی وہ ہمارا آشیاں کیوں ہو

(فانی)

نہ آ قریب کہ پروردۂ فنا ہوں میں
بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیاد

اسی مفہوم میں سہیل کا ایک اور شعر یاد آتا ہے۔ ناظرین لطفِ اندوز ہوں ؎

چشمک کرے مجھی سے یہ بجلی کہاں کی ہے　　بجلی تو خانہ زادِ مرے آشیاں کی ہے

یہ نکتہ کہ رازِ کائنات ایک معمۂ لاینحل ہے شاد، اصغر اور فانی سب نے لکھا ہے، مگر ہر ایک کی شان جدا ہے۔ فرماتے ہیں۔

(شاد)

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی　　نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

(اصغر)

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے کچھ اصل کچھ انداز بیاں ہے

(فانی)

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

شاد اور اصغر دونوں کے اشعار "ہستی" نہیں بلکہ "حکایت" یا "افسانۂ ہستی" کے متعلق ہیں، دونوں نے میر باقر علی افسانہ گو دہلوی کے فن پر ریویو کیا ہے لیکن فانی نے خود میر باقر علی پر ایک مقالہ لکھا ہے اس لئے بہتر ہوگا اگر ہم اس داستان کا فیصلہ بھی میر باقر علی پر چھوڑ دیں!

فانی نے اپنے نظریہ حیات پر مختلف مقامات پر مختلف نقطۂ نظر سے اظہار کیا ہے بعض اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

---

نیرنگیٔ حقیقت ہوں — میں ہوں فانی حقیقت نیرنگ

---

یہ ادراکِ ہستی ہوں تکلف برطرف — زندگی میری دروغِ مصلحت آمیز ہے

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی　　زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

---

جبر و اختیار، حیاتِ انسانی کا ایک نہایت معرکۃ الآرا مسئلہ ہے جس نے حکماء عقلا کے مختلف گروہ پیدا کر دئے ہیں۔ یہی وہ محور ہے جس پر حشر و نشر، سزا و جزا جنت و جہنم، خیر و شر کے مسائل گردش کرتے ہیں۔ شاعر کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ کسی مسئلہ کی علت معلول پر ایک حکیم، فلسفی، ریاضی داں یا ہندس کے نقطۂ نظر سے بحث کرے۔ وہ صرف یہ بتاتا ہے کہ انسانی نقطۂ نگاہ سے کسی واقعہ یا حقیقت پر کیا حکم لگایا جائے۔ وہ ہماری عقل و فکر کو نہیں بلکہ جذبات و حسیات کو اپنا مخاطب بناتا ہے اور حقائق کو ایسے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ جو براہِ راست ہمارے قلب پر منعکس ہو جاتے ہیں اور ہم فی الفور محزون مسرور یا متاثر ہو جاتے ہیں، شاعر کا کمال یہ ہے کہ جس مسئلہ کی تشریح فلسفی اور حکما ضخیم جلدوں میں نہ کر سکیں اس کو وہ ایک شعر میں آئینہ کر دے۔

"جبر و اختیار" پر فانی نے مختلف انداز سے اظہارِ خیال کیا ہے چند نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں ؎

محشر میں جبرِ دست سے طالب، ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

---

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

---

جسمِ آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

---

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی    سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

---

رودادِ مرگ و زیست یہ ہے قصّہ مختصر
مجبورِ زندگی کو بھی جینا محال ہے

---

وہ بندے ہیں جن کو دعویٰ خدائی ہے
نہ تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر

---

دنیا میں حال آمد و رفت بشر نہ پوچھ    بے اختیار آ گئے رہا بے خبر گیا

---

ہوں اسیرِ فریبِ آزادی    پر ہیں اور مشقِ حیلۂ پرواز

اسی مسئلہ کے ایک دوسرے پہلو کو ایک جگہ نہایت حکیمانہ لیکن شگفتہ اور دل نشین انداز سے بے نقاب کیا ہے۔ جس کی تشریح کے لئے یہ اوراق قطعاً ناکافی ہیں، کہتے ہیں ؎

عشق ہے پرتوِ حسنِ محبوب　　آپ اپنی ہی تمنا کیا خوب
طلب محض ہے سارا عالم　　کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب

قلب، ادراک، دماغ اور حواس
مجھ سے منسوب ہیں تجھ سے منسوب

فانی کا شاعرانہ آرٹ دو حالتوں کے مقابلہ کرنے میں انتہائے کمال کو پہونچ چکا ہے۔ اپنے مفہوم کو کبھی ایک دل نشین ترکیب اور کبھی ایک معنی خیز لفظ سے اس طرح ادا کر جاتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جاتی ہے اور طرفۃ العین میں ہمارا ذہن و دماغ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور سارا نقشہ اس طور پر سامنے آجاتا ہے گویا سینما کی تصاویر ہیں جو چشم زدن میں موجود اور غائب ہو جاتی ہیں، ملاحظہ ہو۔

نگاہِ شوق کے دم تک تھی آنکھیں　　اب آنکھیں یادگاریں ہیں نظر کی

---

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

---

ہائے کیا ذوق ہیں کہ نقشِ سجدہ ہے اور سر نہیں
یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبالِ دوش تھا

---

یہاں بلائے شبِ غم وہاں بہارِ شباب
کسی کی رات کسی کے ہیں دن قیامت کے

---

بہار نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری
خزاں شہیدِ تبسم ہوئی بہار ہوئی

---

حُسن ہے جاودانِ۔ بے آغاز
عشق آغازِ جاوداں انجام

---

عہدِ جوانی ختم ہوا اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
ہم بھی جیتے تھے جب تک مرجانیکا زمانہ تھا

---

مژدۂ جنتِ وصال ہے موت
زندگی محشرِ جدائی ہے

کل تک جو ہاتھ چشم و چراغِ جنوں تھا،

ہے آج فرطِ ضعف سے آزارِ آستین

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے فانی "یاسیات" کے امام ہیں، افسردگی و حزن کی ترجمانی ان کا خاص حصّہ ہے اردو شاعری میں یہ چیزیں اس درجہ فرسودہ اور پامال ہو چکی ہیں کہ یہی اب اس کی سب سے بڑی محرومی تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن فانی نے ان کو ایک خاص انداز سے پیش کیا ہے۔ جس میں اُن کی انفرادی حیثیت بدرجۂ اتم نمایاں ہے۔ افسردگی و حزن ہی نہیں، گریبان و دامن "حسن و عشق" "فراق و وصال" "ذرہ و دل" ایسی بالخصوص اردو شاعری کی طویل فردِ جرم کی تعزیری دفعات ہیں۔ یہ چیزیں بجائے خود غیر مستحسن نہیں ہیں، ان سے علیحدہ رہ کر کون ہے جو کچھ کہہ سکتا ہے اور کون ہے جو سننے پر آمادہ ہوگا، غالب نے خود اسے محسوس کیا تھا اور کہتے ہی بن پڑا۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ تو صرف اُردو شعرا کی بد مذاقی، فرسودہ منشی، کم مائگی اور تعصب جہالت اور بے خبری ہے جن کے باعث اُردو شاعری کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا فانی نے ان تمام جذبات و حسیات کی ترجمانی کی ہے لیکن ہر جگہ ان کا دلکش انفرادی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ اقبال کے مانند ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے

یہ کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اردو شاعری کی فرسودہ اور پامال شاہراہ سے گذر رہے ہیں اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ دونوں نے نہایت محنت اور کشادہ جبینی کے ساتھ مختلف زبانوں کا مطالعہ کیا ہے، مختلف سوسائٹیاں دیکھی ہیں مختلف مراحل و منازل سے گذرے ہیں۔ یہ نہیں کیا ہے کہ اپنی غربت اور انفرادیت کو

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

کہہ کر قربان کر دیا ہو اور صرف اشعار کا موزوں کر دینا ہی منصب شاعری کا امتیاز خصوصی قرار دیا ہو۔ ان لوگوں نے اسی کی کوشش نہیں کی کہ مصرعہ موزوں ہوا یا نہیں، ان کا عقیدہ رہا ہے کہ دنیائے شاعری کی قدر منزلت پیش روؤں کی تعداد میں اضافہ کرنا نہیں ہے بلکہ پیش روؤں کے نام کو زندہ کرنا ہے۔ شاعری ہی نہیں جو کام اس نیت اور عقیدہ سے کیا جاتا ہے، بقائے دوام اس کا انجام ہے۔ یہاں فانی کے کلام کے چند ایسے نمونے پیش کرتے ہیں جن کا اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔

افسردگی و حزن:۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشرِ سکوت
تیرے شہید ناز کا ماتم خموش تھا

---

نامرادی حد سے گذری حالِ فانی کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

---

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے
یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

---

اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یارب
در و دیوار دے اب انہیں ویرانی دے

"گریبان و دامن" ایشیائی شعرا کا اس قدر تختۂ مشق رہ چکا ہے جتنا کہ شاید خود کسی دیوانہ عاشق کا دامن کسی زمانہ میں رہا ہوگا۔ کون سی دیجی ہے جس کو اگلے سخنوروں نے چھوڑ رکھا تھا پھر بھی فانی کی تازگی ملاحظہ ہو ؎

وحشت بقیدِ چاک گریباں روا نہیں
دیوانہ تھا جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

---

افشائے رازِ اہلِ جنوں مصلحت نہیں　　پھرتا ہوں دھجیوں کو گریباں کئے ہوئے

---

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کو
گریباں نے گلے لپٹا لیا ہے بڑھ کے داماں کو

---

فصلِ گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی
دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی

---

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی
چاکِ داماں بھی بہ اندازۂ داماں نکلا

شاعری کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ محض اشارہ ہی اشارہ میں ساری تفصیل بیان کردی جائے۔ ایسی حالت میں شاعر ہمیشہ خاکے پیش کرتا ہے۔ یہ کام سامع کا ہے کہ وہ اپنے میلان و مذاق کے مطابق رنگ آمیزی کرتا رہے مصوری میں بھی اس پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہیں بعض بعض مقامات پر محض دھندلے سے نقوش بنا دئے جاتے ہیں جو ہمیشہ موہوم اور غیر متیقن رہتے ہیں۔ دیکھنے والے اپنے متخیلہ سے اس میں خود اپنی "ہیئتِ نگاہ" بناتے مٹاتے رہتے ہیں اور بغایت لطف اندوز ہوتے ہیں، اسی کیفیت کو مدِ نظر رکھکر بعض

ارباب فکر کی رائے ہے کہ خود شاعر کو کبھی اپنے کلام کی تعبیر یا توضیح نہ کرنی چاہیئے اس سے دیکھنے یا سُننے والوں کا تخیل محدود ہو جاتا ہے بعض اشعار بجائے خود ایسے ہوتے ہیں جن کو سننے کے ساتھ وجد طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے معنی دریافت کئے جائیں تو سامع اس کی تعمیل سے قاصر رہے، فانی کے یہ چند اشعار نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں ؎

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آ رہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی

---

لذت فنا ہر گز گفتنی نہیں یعنی　　دل ٹھہر گیا فانی موت کی دُعا کر کے

---

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی
دُنیا ہی بدل دی ہے تعمیر نشیمن نے

---

تجھے خبر ہے ترے تیرے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دِل ناتواں نہیں ملتا

---

فانی وہ میں ہوں نقطۂ موہوم اتصال　　میں عدم کی دونوں حدیں ہوں ملی ہوئی

فانی کے ہاں نزاکت ادا، لطافت خیال، دقت نظر اور نکتہ سنجی اس کثرت سے ہے کہ انتخاب دشوار ہے لیکن اسی کے مقابلہ میں جوش و سرمستی زور بیان شکوہ و بلندی بہت شاذ ہے تاہم اس رنگ میں بھی جو چند اشعار نکل گئے ہیں وہ نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہیں، کہتے ہیں۔

جوش بیان و کیف و سرمستی :-

مظہر ہستی و خلاق عدم ہے مری ذات
کچھ نہ تھا ورنہ بجز سلسلۂ برہم ہوش

---

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

---

چشم ساقی کی وہ مخمور نگاہی توبہ  آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

---

کس طرف جوش کرم تری نگاہیں اٹھیں
کون محشر میں سزاوار عتاب آتا ہے

---

عالم درد کا نظام آکے ذرا الٹ نہ دو  عشق سے فرق آگیا حسن کے امتیاز میں

سُنا ہے اٹھا ہے اک بگولہ جلو میں کچھ آندھیوں کو لیکر
طواف دشتِ جنوں کو شاید گیا ہے فانی غبار میرا

---

"ذرہ لول"

کس نظر سے اس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف
کانپ اُٹھا ہر ذرہ میری خاک دامنگیر کا

---

تیرے گھر کی زمیں ارے توبہ ذرہ ذرہ ہے آسماں انجام

---

دل کیوں شبِ فراق تڑپ کر ٹھہر گیا کیوں اضطراب کیا تیری صورت بدل گئی

---

اخلاقیات :-

عزیز خاطر فطرت ہے جان عبرت ہے
ہر ایک ذرہ جو اس عالم غبار میں ہے

---

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہُوا

مجھ کو میرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا
دولت دو جہاں ندی اِک دل مبتلا دیا

ذرا اس بلند نظر شوخی کی بھی داد دیجئے گا۔

ہر بیگنہ سے دعوئ بخشش ہے روزِ حشر
گویا گناہ کی بھی ضرورت نہیں رہی

---

فانی کے دل سے آہ لاتقنطو کے بعد
زاہد وہ دلفریبیٔ حُسنِ عمل گئی،

"معاملہ بندی" اور "لگاوٹ" کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے
ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

بعض لوگ ایسے ملیں گے جو اس سارے داستان کو سُن کر بول اُٹھیں گے "اور زبان و محاورہ"؟ تمام محبت کے سلسلہ میں یہ نمونے پیش کئے جاتے ہیں

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانی
آپ کی جان سے دور آپ کے مر جانے کا

---

مرا قتل، ان کے ہاتھوں یہ تو باتیں
کچھ ان کے منہ کی ہیں کچھ نامہ بر کی

---

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جاں سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

---

سرکار پاس وضع جفا چاہتا ہوں میں  یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھا نہ کیجئے

---

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

---

دل کا اُجڑنا سہل سہی لیکن سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

---

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

---

اٹھا بھی دے نگہ ماسوا نگر کا حجاب  یہ دیکھنے ہی کا پردہ ہے دیکھتا کیا ہے

---

دیوان میں چند رباعیات بھی ہیں جن میں دو لاجواب ہیں۔

ناکام ازل کی کامرانی معلوم — قسمت میں نہ ہو تو شادمانی معلوم
جینے سے مراد ہے مرنا شاید — ورنہ فانی کی زندگانی معلوم

---

آماجگہ ناوکِ آفات ہوں میں — تلخی کش زہر عیش مافات ہوں میں
عبرت کدۂ دہر میں شاید فانی — جینا ہے گناہ اور مکافات ہوں میں

---

ممکن ہی نہیں یقین ہے، ناظرین مخصوص مباحث و مسائل کی توضیح و تشریح سے اُکتا گئے ہوں گے، اس لئے یہ مختصر لیکن "نو بنو" انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

ہر آن فتنہ ہے ہر فتنہ اک قیامت ہے — ترا شباب ہوا دورِ آسماں نہ ہوا

---

کسی کے ایک اشارے میں کس کو کیا نہ ملا — بشر کو زیست ملی موت کو بہانہ ملا

---

فانی اب اپنی زندگی حسنِ عتاب یار ہے — دیکھئے مرگ ناگہاں لائے پیام یار کیا

---

حسن جیرت نو بسبر ہے تماشا نہ سہی — تیری محفل میں ہیں گو نقش بدیوار ہیں ہم [1]

---

[1] اس سلسلہ میں حزیں کا بھی ایک شعر قابل مطالعہ ہے۔
من از حیرت نواز تمکین نہ ایمائے نہ تقریرے — بداں ماند کہ ہم بزم است تصویرے بہ تصویرے

جیے جانے کی تہمت کس سے اُٹھتی کس طرح اُٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

---

بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے
کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

---

اب لب پہ وہ ہنگامۂ فریاد نہیں ہے
اللہ رے تیری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے

---

دل محشر بخودی ہے اللہ اللہ
یاد اور کس بھول جانے والے کی یاد

---

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر
موت نے عمرِ دو روزہ کا بہانہ چاہا

---

بجلیاں شاخِ نشیمن پہ بچھی جاتی ہیں
کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

---

کم نہ تھی عمر اک نظر کے لئے
عشق تھا مرگِ ناگہاں انجام

---

ادھر بھی دیدۂ عبرت نگاہ ایک نظر
کہ عہدِ شوق کی اک یادگار ہم بھی ہیں
زمینِ گورِ غریباں پہ اک جگہ نہ ٹھہر
یہیں کہیں نگہ شرمسار ہم بھی ہیں

---

نازِ جہاں کیا ہے مجبورِ فنا ہونا — سرمایۂ ہستی ہے محرومِ بقا ہونا

---

وحشتِ دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا — دیوانے بہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

---

کیا ہے خلق تجھے باوجودِ علمِ گناہ — یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

---

ترا اسیر ہوں چاہے تو ذبح کر صیاد — نہ توڑ دل کو امانت ہے آشیانے کی

---

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

---

آکے تماشا گاہِ جہاں میں دادِ تماشا کیا چاہوں — یاں ہر ذرہ کہتا ہے میں ذرہ نہیں اک صحرا ہوں

---

**ابہام بالائے علم** شراب کے تمام عیوب سننے کے بعد کوئی سوختہ سامان بول اٹھا "ہنرش نیز بگو" بہت ممکن ہے موجودہ داستان سرائی پہ کوئی دل جلا پکار اٹھے "عیبش نیز بگو"، یہ تو معلوم ہے ان سطور سے ہر شخص نا رضامند رہیگا کیونکہ غلطی سے اس میں کوئی نامعقول بات اب تک نہیں کہی جا سکی اس لئے ———

(ملاحظہ ہو اس حقیقہ مضمون کا عنوان)

اس دیوان میں بہت سے ایسے اشعار بھی ملیں گے جو فانی ایسے سخنور کے شایان شان نہیں ہیں۔ راقم الحروف نے اس کی "باضابطہ اطلاع" فانی صاحب کو دیدی تھی لیکن موصوف نے اسے "غیر متعلق" قرار دیکر اپنا فیصلہ بحال رکھا۔ بہر حال اس کی ذمہ داری سے خاکسار سبکدوش ہے۔ بعض اشعار ایسے بھی ملیں گے جن میں ایک مصرعہ نہایت بلند ہے تو دوسرا نسبتاً پست، اس کا شمار نقص میں بھی ہو سکتا ہے اور حسن میں بھی، بہر حال ان میں سے چند اشعار یہ ہیں جن مصرعوں کے اوپر خط کھینچ دیا گیا ہے وہ راقم الحروف کو بذاتہ دوسرے مصرعے سے پست معلوم ہوئے۔

---

تعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

---

گلشن صلائے عام اسیری ہے سر بسر — پھیلا دیا بہار نے پھولوں پہ دام عیش

---

صدقے اتریں گے اسیرانِ قفس چھوٹے ہیں — بجلیاں لے کے نشیمن پہ گھٹا بھی آئی

---

دو تین ہچکیوں میں دمِ نزع کہہ گیا — شرح دراز زندگی، مختصر کو میں

---

غالب کے ہاں "نوحۂ غم" اور "نغمۂ شادی" دونوں ملیں گے، فانی کے ہاں صرف نوحۂ غم ہے مگر پھر

"کون سا نغمہ ہے۔ جو اس ساز میں نہیں"

یہ تو فانی کے متعلق رہا اب رہا میں خود۔ اس سلسلہ میں یہ "سرود و مستاں" بھی غالباً بے محل نہ ہوگا۔

**سرود و مستاں** ہر عقلمند شخص کے لئے دو حماقتیں ضروری ہیں، ایک شادی دوسری شاعری۔ شادی اضطراری ہے اس لئے اس سے مفر نہ ہوا۔ شاعری اختیاری تھی اس لئے اس کی کوشش کی مگر بقول آتش جب موصوف "جوان" تھے بالقول فانی جب ممدوح کے۔

"مر جانے کا زمانہ تھا"

بہ ہزار دقت اور اس میں غالباً کچھ سرقہ اور اتنا ہی توارد بھی شامل تھا، دو مصرعے گھڑے گئے لیکن قبل سیح اڈیشن کے ایک استاد نے۔

عندلیبی کی بخفیں جس نے آنکھیں دیکھیں

بتایا کہ ایک مصرعہ تو موزوں نہیں ہے اور دوسرا بے معنی ہے، میں نے جی کڑا کر کے دریافت کیا کہ اگر دونوں ملا دئے جائیں تو کچھ کام کی بات نکل آئیگی انہوں نے کہا دو مہمل مل کر ایک معقول کب ہوتا ہے میں نے ذرا ڈھیٹ ہو کر کہا آخر انگریزی میں "بلینگ درس" بھی تو مروج ہے کہنے لگے اردو میں ڈھل "قافیہ بھی" تو ہے

بہر حال مرحوم نے اس کے بعد کی رباعیات ، معلوم کی ہیں نے بھی فرط عقیدت سے
اپنے دو نوں مصرعے ان کے لوح مزار پر ثبت کرا دیے چاہے لیکن ، دھر قبر
جات کے مسائل ایسے پیش آئے کہ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس دور فتنہ میں
اس کا ارادہ کیا گیا تو مرحوم "خاکسار" پسماندہ اور با قیات صالحات ، دو مصرعے
کسی کی چیز نہیں بھوتا ان کو بھا گشت تمام منتقل کر دیا گیا تھا اب بعض لوگوں
نے ان کو اڑا لیا ہے اور اب ایسے دو مصرعوں کی دولی یہ ہوئی ہے ۔

اس اظہار حال کے بعد ناظرین خود فرمائیں کہ کلام ثاقب کا ان باقیوں کی
نشر چاہو گا جس نے یہ سارا وقت ثاقب صاحب سے نادی بنشیں ۔ اب یہ ان کے
نصیب کہ ان کو کوئی نہ ملا اور انہوں نے غالب "سکوت سخن شناس" یہ
قسمین ، سخن ناشناس کو ترجیح دی ۔ داستان طول ہو گئی ، عام طور پر اس کے
دو صاحب ہوئے ہیں جو کہ یا ہر زہ سرائی یا دونوں ناظرین ہی سمجھ میرے
خیر کی کا احساس نہ رکھتے ہوں گے ، کچھ میں کہ ہر زہ سرا ایک مختلف ہو گئے
اور کچھ بلحاظ رجع شرا ، دونوں کے قائل ۔ بہر حال ہر ایک کے لئے کوئی
سوا ہے البتہ دعا یہ ہے کہ ان سطور کا مشہ ایسے ناشروں سے ہو جو سند کہ
سودہ بیسہ محروقات یا ادھورا مضمون ہو اپنی طرف سے البتہ بعض وہ
سکتے ہوں کہ اس قسم کے "جرأت رندانہ" یا "شوق فضول" کا
آئندہ موسم نہ کریں گا ۔

ناظرین دعا کریں "فسخ عزائم" کی نوبت نہ آئے کیونکہ میں وجود باری کا قائل ہوں،
علماً، عملاً، فطرتاً، واقعتاً، اخلاقاً، ضرورتاً اور وغیرہ

---

اس تمام قصہ میں میں نے اگر کہیں بے انتہا توجہ اور احتیاط کو دخل دیا ہے تو وہ ایک ہی شعر کو مختلف مقامات پر پیش کرنے ہی سے گریز تھا ممکن ہے کہیں شروع گذاشت ہو گئی ہو۔ میں جانتا ہوں اس سے پڑھنے والوں کی طبیعت بدخط ہوتی ہے، اکثر ایسے اشعار ملیں گے جو ایک سے زیادہ مواقع پر نہایت موزونی کے ساتھ چسپاں ہو سکتے تھے لیکن اسی اندیشہ سے میں نے ان کو بار بار چھیڑنے سے اجتناب کیا ہے۔ نظر بر آں ناظرین سے داد کا اور قافی صاحب سے عفو کا طالب ہوں۔

رشید احمد صدیقی (علگ)
مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# تبصرہ

ایسی حالت میں کہ کلام فانی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے جلیس قدیم صدیقی کا شوکت الآراء مقدمہ پریس سے باہر نکلنے والا ہے میرے خاص احباب اور خود میری طبیعت مجبور کرتی ہے کہ میں اپنے ان خیالات کو کسی نہ کسی طرح ظاہر کروں جو میرے دل و دماغ میں فانی اور کلام فانی کے متعلق جاری و ساری ہیں اس لئے میں سخن چشیدہ ناظرین کی خدمت میں اس قدر عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ وہ میرے اس مضمون میں اگر کسی تفصیل و تشریح کی تلاش کریں گے تو غالباً ان کو اپنی اس طلبِ تشنگی کے لئے کوئی سامان سیرابی نظر نہ آئے گا۔ کلام فانی کی خصوصیات سوز و گداز کے نازک و لطیف جذبات و احساسات کی توضیح و تشریح کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ جب جلیس جیسی باکمال و جامع ہستی دو صفحات لکھ کر بھی مطمئن نہیں تو کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ محض ایک شاعرانہ تنقید کے فرائض بھی صرف چند صفحات کے دائرے میں رہ کر ادا کرے پیشِ نظر مضمون میں بجز اس کے کوئی راہ باقی نہیں کہ چند اشارات

کنایات سے کام لے کر تا امکان اپنا مافی الضمیر ادا کردوں۔ مجبوراً یہی طریقہ اختیار کیا اور یہ سمجھ کر ایک گونہ مطمئن بھی ہوں کہ کلام فانی سے جو حضرات محظوظ ہو سکتے ہیں ان کے لئے درحقیقت اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔

شاعر جس کے قوائے ظاہری و باطنی نے مناسب ماحول میں تربیت پائی ہے صحیح معنوں میں شاعر ہے، ایسا شاعر دنیائے مشاہدات و محسوسات سے لیکر عالم کیف و وجدانیات تک کے ہر ہر ارتعاش و سکون سے، کبھی حالت احساس و ہوش میں کبھی مطلق بیخبر ہو کر متاثر ہوتا رہتا ہے بعض اوقات یہ تمام تاثرات بیکبارگی کلام موزوں بن کر اس کے لبوں پر رقص کرنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی رموز فطرت کا خزانہ دار دل اس کے ان تاثرات کو جمع کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آجاتا ہے جب اُس کا روکنا دشوار ہو جاتا ہے اور شاعر از خود رفتہ ہو کر اپنی بلند مقامیوں کو بھول جاتا ہے، اسے ایک ایسی طاقت جسے وہ اپنی اصطلاح میں کبھی حسن کہتا ہے کبھی عشق پستی کی طرف ڈھکیل دیتی ہے، اس وقت شاعر صرف شاعر رہ جاتا ہے۔ عارف رومیؒ نے اس حقیقت کی طرف کس بلیغ پیرایہ میں اشارہ کیا ہے

"چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں"

عروج و نزول، نزول و عروج یہ عجیب متضاد حقیقتیں ہیں جن کو اگر نمایاں طور پر اور اجتماعی صورت میں دیکھنا ہے تو شاعر کا کلام اس کی صد ہا مثالیں پیش کر سکتا ہے جیسا کہ میں نے کہا ایک طرف شعر نتیجہ ہے شاعر کی اس مستی کا جس سے لبا لب وہ

دور کا عامل و بجز بجائے دوسری طرف بھی پہنچتا ہے وقت واحد میں انھیں
انسانی کو دوسروں کی دلچسپیوں سے بھی اونچا اور اچھال دیتی ہے۔ جب سننے والا اضافہ
شعری سے بحث کر خود کرتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ ابھی تھوڑی
دیر پہلے جس عالم میں تھا وہ اسے اپنے وہم و خیال میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔

یہ ضروری نہیں کہ شاعر فطرت سے اکتساب اثر ایک ہی طریقہ اور ایک ہی
قاعدہ و قانون کے تحت ہی کیا کرتا ہے۔ وہ صرف اپنے تاثرات لفظ کے ذریعہ پیش
کر سکتا ہے کبھی وہ پھولوں کی رنگینی اور رعنائی میں ظاہر ہو کر مشاہدہ کرتا
ہے کبھی اس کو ایک ایک کا شاعر وہی پیدا ہیں نظر آتا ہے۔ وہ کائنات عالم کے ہر
انقلاب حسن و رنگ کا مطالعہ کرتا ہے لیکن ان نگاہوں سے ان کی دلچسپی کا
تصور ہی الفاظ۔ یہ جان الفاظ ان کے سرمدی نغموں میں روح پیدا کی
پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ خود ان کے لفظ لفظ میں روح سا بھر دیتے ہیں۔

لہذا ماننا پڑے گا کہ اس سے زیادہ کوئی توہین نہیں ہو سکتی کہ بعض حضرات
شاعری کی تشریح کے باوجود بھی اس کو مفید صورت میں رکھنا چاہتے ہیں اور
مفید و غیر مفید معلوم کرنے کا معیار بھی ایسے حضرات کی ایجادات و اختراعات
کا مرہون منت ہے۔ میں آرٹ کی تعریف میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ وہ
آرٹ ہے شاعری کو شراب کی نہ شراب معرفت کہنا چاہتا ہوں اور نہ خواہ مخواہ انگور
کا عامل۔ اس کا اظہار سننے والے کے ذوق وجدان پر ہی چھوڑ دینا بہتر ہے

نزدیک سب سے زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔ جن حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ شعر و شاعری کی تمام لطافتیں اور ان کا مقصودِ حقیقی صرف مادیات ہیں حسبِ لخواہ تغیر و انقلاب پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہیں ان کی خدمت میں گذارش کروں گا کہ وہ صحیح معنوں میں نہ (آرٹ) ہی کو سمجھتے ہیں نہ (آرٹسٹ) کو بہت ممکن ہے کہ ان حضرات میں سے کچھ ایسے بھی ہوں جنہیں روحانی مطالبات کا بھی علم ہو لیکن غالباً وہ اس حقہ روح سے بالکل بے خبر ہیں جس کا خلاصہ صرف پرواز و اضطراب ہے میں یہ یقین کر لینے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا کہ شاعری اور صرف شاعری سے دُنیا کی سلطنتوں میں عظیم الشان انقلابات و تغیرات رونما ہوئے اگر ہم اوراقِ تاریخ کو آج کی نظر سے نہ دیکھیں اور ہم اسباب و علل کو بھی جمع کر سکیں تو یقیناً یہ نظریہ از خود باطل ثابت ہو جائے گا۔ لیکن باوجود اس کے بھی کہ شاعر کا کوئی محدود دائرہ نہیں ہوتا اس کا کلام اعلیٰ اخلاقی معیار سے کبھی گرا نہ ہونا چاہیئے آپ کو کسی کے کلام میں اگر اس کے خلاف کچھ نظر آئے تو اس میں شاعری کا قصور نہیں بلکہ خود شاعر کی اخلاقی پستیاں اور سوسائٹی کے اثرات شامل ہیں جو کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ جناب فانی کا کلام اس قسم کے تمام معائب سے پاک ہے لیکن یہ کہ انہوں نے اپنا مقصد پہلے سے معین کر لیا ہے۔ ایسا بھی نہیں۔

تمام حقیقتیں جب عالم کیف و حال میں آتی ہیں دو صورتوں سے خالی نہیں

ہوتی، یا تو شاعر اُن سے اکتسابِ غم کرے گا یا اکتسابِ مسرت، غم و مسرت کے علاوہ جو چیز ہے مجھے اس کی اصلیت و حقیقت سے انکار نہیں لیکن در اصل وہ انہیں دونوں حقیقتوں کی ایک لطیف ترین امتزاجی کیفیت کا توازن ہے۔ جناب اصغر صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

بارِ الم اُٹھایا رنگِ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی اندازِ بے حسی کے

شاعر کی استعدادِ فطری اس کے حالاتِ فطری کی مناسبت میں رنگ کو چاہے اختیار کرلے، میرا یہ مطلب نہیں کہ شاعر ایک قسم کے جذبہ سے متاثر ہو کر دوسرے جذبات کو یک قلم فراموش کر دیتا ہے بلکہ میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ خود شاعر کی باطنی استعداد جس رنگ کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہمیشہ وہی رنگ اس کی شاعری کا نمایاں اور کامیاب رُخ ہوا کرتا ہے۔ کیفیات و احساسات کا طریقۂ ادا بھی ایک ضروری چیز ہے، وہی ایک بات واعظ کہتا ہے لیکن بے اثر اور بے مزہ وہی بات جب شاعر کی زبان سے ادا ہوتی ہے تو سُننے والا بیتاب ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے، صرف شاعر کے اندازِ بیان کی شگفتگی و اسلوب جب تک حقیقتیں محض مسائل کی صورت میں بیان کی جائیں گی ہمیشہ شاعری ناکامیاب رہے گی لیکن جب ان کو بادہ و ساغر حُسن و عشق، نیاز و ناز کی چاشنی دیکر پیش کیا جائے گا دل میں اتر جائیں گی اور روح کو بالیدہ کردیں گی غالب نے اسی لئے کہا تھا ع "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"

جنابِ فانی ان تمام خصوصیات کے اعتبار سے صحیح معنوں میں شاعر ہیں، وہ از سر تا پا شعریت میں ڈوبے ہوئے ہیں، ان کے واقعاتِ زندگی حسن و عشق کی واردات و لذات سے بھرے ہوئے ہیں، وہ اپنے سینہ میں ایک ایسا پر گداز قلب رکھتے ہیں جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ

"ہر لحظہ و ہر ساعت دنیائے دگر دارد"

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جوش و اصلیت کے ساتھ ساتھ غم کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ان کا انداز اپنے معاصرین سے بالکل جداگانہ ہے وہ سیدھی سی بات بھی اس ٹیڑھے اور بانکپن سے کہتے ہیں جو صرف انہیں کا حصہ ہے۔ کبھی وہ تقابل و تضاد سے ایک ایسی لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں جو ذہن میں آ ہی نہ سکتی تھی کبھی اتنی دور سے مصرعہ لگاتے ہیں کہ سننے والا حیران ہو جاتا ہے، ان کے اندازِ بیان میں ایک خصوصیت سب سے زیادہ واضح نظر آتی ہے۔ وہ شعر میں کبھی اپنا پورا مفہوم ادا کر دینے کے عادی نہیں بلکہ صرف الفاظ کے ذریعہ سے کچھ اشارات کر دیتے ہیں، سننے والا سنے۔ سمجھے اور نتیجہ نکالے

"تصنع و نقالی آجکل کے اکثر مشہور اساتذہ کا شیوۂ خاص ہے لیکن جنابِ فانی کو اس سے سخت نفرت ہے۔ ان کے پورے کلام میں شاید ہی کوئی ایسی مثال مل سکے۔ میری نظر میں تو اب تک آلودۂ متصنعیت نہ ہو سکیں۔ مختصراً یہ کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں حال کہتے ہیں، کلامِ فانی میں یہ خصوصیتیں اس شدت سے پائی جاتی ہیں کہ

ان کے کلام کا کوئی حصہ اس لطف و اثر سے خالی نہیں۔

---

میں نے اکثر حضرات کو فخریہ یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ غالب و مومن و میر و درد کی تقلید کرتے ہیں، حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس سے زیادہ شاعر کی شاید کوئی توہین خیال میں بھی نہیں آسکتی ہو۔ یہ حضرت بزعم خود اپنے ان لاطائل دعاوی سے یہ مطلب نکال کر خوش ہو لیتے ہیں کہ اس طرح ان کا غالب، یا مومن یا میر ثانی بن جانا ان کے لئے معراجِ کمال ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ خود ان کی اپنی کوئی ہستی باقی نہیں رہ جاتی۔ حقیقتاً یہ صرف اس ہستی کا کمال ہے جس کی تقلید کا دعویٰ کیا جاتا ہے، اور جو ان مختلف پردوں سے (اگر صحیح معنوں میں یہ پردے بھی کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں) آواز بلند کرتا ہے۔ آپ اگر خالی الذہن ہو کر دیکھیں گے تو غالباً آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ فانی کے معاصرین میں سے بہت کم ایسی ہستیاں ہیں جو خود اپنا کوئی مستقل وجود رکھتی ہیں ورنہ عام طور پر لفاظی و فریب نگاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ فانی اپنی ایک مستقل ہستی رکھتے ہیں، وہ کسی کے رنگ و تقلید کے مرہونِ منت نہیں یا بالفاظ دیگر وہ صرف تلمیذ الرحمٰن ہیں، ان کا خود ایک رنگ ہے، انہوں نے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کا ننگ گوارا نہیں کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ان کے کلام میں غالب و مومن کا اندازِ بیان اور بلندیٔ تخیل، میر کا

درد اور گداز پایا جاتا ہے لیکن یہ ایک ایسا امتزاج ہے جو تکلف و تصنع سے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ از خود پیدا ہو گیا ہے۔ اور اس طرح گویا جناب فانی ایک مستقل رنگ کے مالک ہیں۔ ان کے کلام میں شوخی و رنگینی، مستی و بیخبری بھی پائی جاتی ہے لیکن کم از کم یہ انداز حضرت اصغر گونڈوی کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ جناب اصغر کی طرح حضرت فانی کا بھی ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے رنگ خاص میں بڑی سے بڑی حقیقت کو اس سادگی و پرکاری کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ بسا اوقات اہل نظر بھی آسانی سے گذر جاتے ہیں۔ جذبات کی مصوری، تخیل کی بلندی، واقعات و واردات کی نیرنگیوں کے ساتھ کامیاب طور پر بہت کم کی جا سکتی ہے۔ لیکن جناب فانی میں یہ کمال بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

---

افسوس کہ جس قدر کلام فانی کے متعلق لکھنا چاہتا تھا نہ لکھ سکا جناب فانی کا اصرار ہے کہ "جلد ختم کر دو" وقت کے علاوہ دیوان کے صفحات میں بھی زیادہ گنجائش نہیں، اس لئے زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ انکے کلام کا کچھ انتخاب بلا کسی توضیح و تشریح کے پیش کر دوں تا کہ اہل نظر اندازہ کر لیں کہ میں نے جو کچھ فانی اور کلام فانی کے متعلق کہا ہے اس میں مداحی کا کوئی عنصر شریک نہیں، بلکہ حقیقتاً ایسا ہی ہے۔

پہلے میں نے صرف ردیف "الف" کی تقطیع کا انتخاب کیا تھا لیکن جناب فانی اس پر

بھی آمادہ نہیں، مجبوراً چند اشعار پیش کئے دیتا ہوں ناظرین باقیاتِ فانی کو بنظر غور دیکھ کر خود میرے خیالات کی تصدیق فرمالیں۔

احساس غیر بادہ گوارا ہوا ہے مجھے
لا جام ساقیا ہے مینا گداز کا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا
بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

ہجوم جلوہ کو ہے ایک زندگی درکار
کوئی اجل کی طرح دیدہ آشنا نہ ملا

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

فغاں نے کوئی اثر تو کیا یہ کیا کم ہے
یہی سہی کہ وہ آزردۂ فغاں نہ ہوا

کچھ بھی ہو برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں
اک بے قرار تڑپا اک دل فگار رویا

لکھ چکے ہم جا چکا خط گر یہی حالت رہی
ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

عجلتِ پرواز جب ملنے بھی دے راہِ گریز
یوں تو کھلنے کو قفس کا در کھلا اکثر کھلا

بنتی نہیں ہے صبر کو رخصت کئے بغیر / کام آنکھ بے قرار نگاہوں سے پڑ گیا
بچ رہا تھا ایک آنسو دارِ گیرِ ضبط سے / جوشِ غم نے پھر اسی قطرے کو دریا کر دیا

ہائے کیفیت نہیں کہ نقش سجدہ ہے اور سر نہیں
یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبالِ دوش تھا

عشق کی دنیا زمیں سے آسماں تک شوق تھی
تھا جو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا

وہ جلوہ مفتِ نظر تھا، نظر کو کیا کہیے / کہ پھر بھی ذوقِ تماشا نہ کامیاب ہوا
اشتعالِ شوقِ پرستش کا دل ہے منحصر / وعدۂ دید حجاب ہے رحمتِ انتظار کیا
مراد جو ہے مری نگاہِ خود نشناسا / وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا
سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار / نہ شوق ہوتے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا

اس جانِ تمنا سے بے پردہ نہ کر شکوہ
وہ تجھ سے خفا ہے تو جینے سے خفا ہو جا

جگر مراد آبادی

# حصّہ دوم

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# ردیف الف

ٹوٹا طلسمِ ہستیِ فانی کے راز کا
احسان مند ہوں المِ جاں گداز کا

تمہیدِ صد ہزار قیامت ہے ہر نفس
عنوانِ شوق ہوں گلۂ ہائے دراز کا

عبرت سرائے دل میں ہے آوازِ دور باش
مارا ہوا ہوں خاطرِ حسرت نواز کا

اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارۂ جمال
منہ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا

نا آشنائے لطف ہوں بیگانۂ عتاب
صورت شناس ہوں نگہِ امتیاز کا

احساسِ غیر بادہ گوارا ہوا مجھے
لا جام ساقیا مئے مینا گداز کا

فانی دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں
کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

بے اجل کام نہ اپنا کسی عنوان نکلا
دم تو نکلا مگر آزردۂ احساں نکلا

آ گئی ہے ترے بیمار کے منھ پر رونق
جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

دلِ آگاہ سے کیا کیا ہمیں امیدیں تھیں
وہ بھی قسمت سے چراغِ تہِ داماں نکلا

دل بھی ننھا منھ سے بس اک آہ نکل جانے تک
آگ سینہ میں لگا کر غمِ پنہاں نکلا

چارہ گر ناصحِ مشفق دلِ بے صبر و قرار
جو ملا عشق میں غمخوار وہ ناداں نکلا

شکوہ منظور نہیں تذکرۂ عشق نہ چھیڑ
کہ وہ درپردہ مرا حالِ پریشاں نکلا

بجلیاں شاخِ نشیمن پہ بھی جاتی ہیں
کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی
چاکِ داماں بھی باندازۂ داماں نکلا

ہائے وہ وعدۂ فردا کی دمِ وقتِ اخیر
ہائے وہ مطلبِ دشوار کہ آساں نکلا

شوقِ بیتاب کا انجام تحیر پایا
دل سمجھتے تھے جسے دیدۂ حیراں نکلا

اس نے کیا سینۂ صد چاک سے کھینچا فانی
دل ہی کہتا ہوں وہ کہتا ہے کہ پیکاں نکلا

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

کعبہ کو دل کی زیارت کے لئے جاتا ہوں
آستانہ ہے حرم میرے صنم خانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

اب اسے دار پہ لیجا کے سلا دے ساقی
یوں بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

وحدتِ حسن کے جلووں کی یہ کثرت اے عشق
دل کے ہر ذرے میں عالم ہے پری خانے کا

چشمِ ساقی اثرِ مے سے نہیں ہے گلرنگ
دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا

لوحِ دل کا غمِ الفت کو قلم کہتے ہیں
کُن ہے اندازِ رقم حسن کے افسانے کا

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں
کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا

کس کی آنکھیں دمِ آخر مجھے یاد آئی ہیں
دل مرقع ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانیؔ
آپ کی جان سے دور آپ کے مرجانے کا

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

کسی کے ایک اشارے پہ کس کو کیا نہ ملا
بشر کو زیست ملی موت کو بہانہ ملا

مذاقِ تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا
بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

دلِ بیمار سے میرا حال چارہ ساز نہ پوچھ
بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا

خدا کی دین نہیں ظرفِ خلق پر موقوف
یہ دل بھی کیا ہے جسے درد کا خزانہ ملا

دعا کو ہائے اثر ہے گدا پہ تکیہ نہ کر
کہ اعتماد اثر کیا ملا ملا نہ ملا

ظہورِ جلوہ کو ہے ایک زندگی درکار
کوئی اجل کی طرح دیدہ آشنا نہ ملا

تلاشِ خضر میں گم روشناس خضر نہیں
مجھے یہ دل سے گلا ہے کہ رہنما نہ ملا

نشانِ مہر ہے ہر ذرہ، ظرفِ مہر نہیں
خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

مری حیات ہے محرومِ مدعائے حیات
وہ رہگذر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

وہ نامراد جل بزم یاس میں بھی نہیں
یہاں بھی فانیؔ آوارہ کا پتا نہ ملا

ہل گیا زنداں بُرا ہو نالۂ شبگیر کا
چونک اٹھا گھبرا کے ہر حلقہ مری زنجیر کا

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر
کیا یہ ساری عمر منہ تکتی رہیں تقدیر کا

میرے دل سے پوچھتے ہیں آپ کیا وجہ خلش
یاد ہے گم ہو گیا تھا کوئی پیکاں تیر کا

عشق کا بھی کیا نصیبہ ہے دل اب دل نہیں
آئینہ ہے غم کی جیتی جاگتی تصویر کا

آپ کی آزردگی بے سبب بھی خوب ہے
کیا نہیں کا ہے تقاضا جذبِ بے تقصیر کا

کس نظر سے اس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف
کانپ اٹھا ہر ذرہ میری خاکِ دامنگیر کا

برق کو اب کیا غرض کیا رکھ گیا کیا جل گیا
جل گیا خرمن میں جو کچھ تھا مری تقدیر کا

فکرِ راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی
ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا

نامرادی حد سے گذری حالِ فانیؔ کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

یہ کس قیامت کی بےکسی ہے نہ میں ہی اپنا نہ یار میرا

نہ خاطرِ بے قرار میری نہ دیدۂ اشکبار میرا

نشانِ تربت عیاں نہیں ہے نہیں کہ باقی نشاں نہیں ہے

مزار میرا کہاں نہیں ہے کہیں نہیں ہے مزار میرا

وصال تیرا خیال تیرا جو ہو تو کیوں کر نہ ہو تو کیوں کر

نہ تجھ پہ کچھ اختیار دل کا نہ دل پہ کچھ اختیار میرا

نگاہِ دلدوز کی دُہائی جمالِ جانسوز کی دُہائی

رہِ محبت میں غم نے لوٹا شکیب و صبر و قرار میرا

میں ذرّہ نفرت ہے جاں بلب ہوں تمہیں یقیں وفا نہیں ہے

مجھے نہیں اعتبار اپنا تمہیں نہیں اعتبار میرا

قدم نکال اب تو گھر سے باہر جو دم بھی سینہ سے ہمل نکلے

دکھا نہ اب انتظار اپنا لحد کو ہے انتظار میرا

تماشا اُٹھا ہے اک بگولہ جلو میں کچھ آندھیوں کو لیکر

طوافِ دشتِ جنوں کو شاید گیا ہے فانی غبار میرا

قربانِ عشق موت بھی آئی تو کیا ہوا
اس تیر بے خطا کا نشانہ خطا ہوا

کیوں خونِ دل لگی ہی بجھی جگر میں آگ
اے ننگِ عاشقی تری غیرت کو کیا ہوا

قاتل سنبھل کہ یہ نگہِ واپسیں نہیں
خنجر ہے میرے دل کے لہو میں بجھا ہوا

اے جذبِ بیخودی ترے قربان جائیے
پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا

طوفاں ہی ایک کیا مجھے طوفاں سے کم نہیں
لنگر ہوا سفینہ ہوا ناخدا ہوا

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

فانی طلسمِ رازِ حقیقت یہ ہے کہ ہے
تجھ پر تری نگاہ کا پردہ پڑا ہوا

یہ ضبط بھی ادب آموزِ امتحاں نہ ہوا
کوئی ستم کبھی تقریبِ الاماں نہ ہوا

شبِ مرگ ہجر کٹی تم سے عشق سے سبکدوشی
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

اجل کے زیرِ اثر ہو وہ نقشِ ہستی کیا
ہوا کہ برق کے سایہ میں آشیاں نہ ہوا

کسی کی پرسشِ پنہاں سے کیوں ہو داد طلب
وہ حال جو کبھی منت کشِ زباں نہ ہوا

فغاں نے کوئی اثر تو کیا یہ کیا کم ہے
یہی سہی کہ وہ آزردۂ فغاں نہ ہوا

دل آپ یار سے روداد غم کہے تو کہے — مری زباں سے تو یہ ماجرا بیاں نہ ہُوا

جہانِ جاں میں نہیں یادِ یار دل میں نہیں — جمالِ یار کا چرچا کہاں کہاں نہ ہُوا

ہر آن فتنہ ہے ہر فتنہ اک قیامت ہے — ترا شباب ہُوا دورِ آسماں نہ ہُوا

ہمیں ابھی نئے اشعار یاد ہیں قابلؔ

ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہُوا

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا — دولتِ دو جہاں نہ دی اِک دلِ مبتلا دیا

دل ہی نگاہِ ناز کا ایک دشناس تھا — جلوہ برق طور نے طور کو کیوں جلا دیا

قبر میں یا حبیب کی طرح دل کی تڑپ کم ہوئی — یارِ خرامِ ناز نے حشر کا آسرا دیا

روزِ جزا گلہ تو کیا شکرِ ستم ہی بن پڑا — ہائے کہ دل کے درد نے درد کو دل بنا دیا

اپنی ہی لاش پر حضور روتے کو روتے تو ہیں — آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا

دل میں سما کے پھر گئی آس بندھا کے پھر گئی — آج نگاہِ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا

اُف کہ گناہگار ہم تو ہیں مگر خطا معاف — آٹھ پہر کے وصل نے دل ہی تو ہے دکھا دیا

آپ ہم اپنی آگ میں اے غمِ عشق جل بجھے — آگ لگے اس آگ کو پھونک دیا جلا دیا

یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات — چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سلا دیا

گریۂ آتشیں کی داد دے شبِ غم تو کون دے — خود سرِ شام کیا کبھی شمع نے دل بجھا دیا

یاس نے درد کی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانیؔ ناامید کو موت کا آسرا دیا

کچھ اس طرح تڑپ کر میں بیقرار رویا — دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا

کیا اس کو بیقراری یاد آ گئی ہماری — مل مل کے بجلیوں سے ابرِ بہار رویا

آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں — دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

نازک ہے آج شاید حالت مریضِ غم کی — کیا چارہ گر نے سمجھا کیوں زار زار رویا

کچھ بھی ہوں ہستی و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں — اک بیقرار تڑپا اک دل فگار رویا

فانیؔ کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے
کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رویا

کہتا ہے غمِ یار میں ہوں جانِ تمنا — دنیا ہے مری عالمِ امکانِ تمنا

مضمون تو مکتوبِ دل کا نہیں معلوم — لکھا ہے مرے خون سے عنوانِ تمنا

آہستہ گزر صرصرِ غم وادیٔ دل میں
برباد نہ کر خاکِ شہیدانِ تمنا

جز داغ نہیں کوئی چراغِ سرِ تربت
سینہ ہے مرا گورِ غریبانِ تمنا

ہے یاد تری رونقِ خلوت گہِ خاطر
ہے ذکر ترا شمع شبستانِ تمنا

نالے ہیں نہ آہیں نہ خلش ہے نہ تپش ہے
باقی نہ رہا کوئی زباں دانِ تمنا

کیفیت نامیٔ دل کیا کہوں فانیؔ
دل ٹوٹ گیا توڑ کے پیمانِ تمنا

کچھ کم تو ہوا رنجِ فراوانِ تمنا
آغارِ حسینوں گو نہیں پایانِ تمنا

پھر یاس نے رکھا ہے قدم خانۂ دل میں
یعنی ہے اب اللہ نگہبانِ تمنا

گو چاک ہوا دل مگر ارماں نہ نکلے
بے فائدہ کھولا درِ زندانِ تمنا

افسانۂ مرا خوابِ زلیخائے محبت
جلوہ ہے ترا یوسفِ کنعانِ تمنا

جز وعدۂ باطل نہیں بنیاد کچھ اسکی
دل کانپ اٹھا دیکھ کے ایوانِ تمنا

اک جان ہے وہ خیر سے وارفتۂ غم ہے
اِک دل ہے سو ہے سوختہ سامانِ تمنا

فانیؔ کا دم اک دن ترے قدموں پہ نکل جائے
دل کی یہ تمنا ہے اب اے جانِ تمنا

مدت سے ہے دل خانۂ ویرانِ تمنا — اب کوئی تمنا ہے نہ سامانِ تمنا

سمجھو تو بہت فرق ہے اغیار میں مجھ میں — میں آپ پہ قربان وہ قربانِ تمنا

پہلو بھی بدلنے نہیں پاتے مرے ارماں — اب ضبط سے دل بنا دبستانِ تمنا

کیا چارہ گر اب بھی تجھے امیدِ شفا ہے — یہ زخم ہے یہ دل ہے یہ پیکانِ تمنا

آلودہ نہیں خونِ تمنا سے وہ دامن — رنگیں ہے مرے خون سے دامانِ تمنا

اللہ بچائے نظرِ یاس سے دل کو — امید ہے پھر سلسلہ جنبانِ تمنا

یہ سحر ہے فانیؔ کہ غمِ عشق ہے کیا ہے

دل قطرۂ خوں جس میں ہے طوفانِ تمنا

وائے نادانی یہ حسرت تھی کہ ہوتا در کھلا

ہمقفس رازِ اسیری کیا کہیں کیوں کر کھلا

فرصتِ رنجِ اسیری دی نہ ان دھڑکوں نے ہائے

اب چھری صیاد نے لی اب قفس کا در کھلا

اللہ اللہ اک دعائے مرگ کے دو دو اثر

واں کھلا بابِ اجابت یاں قفس کا در کھلا

اُف اس آزادی کے ہنگام کی مجبوریاں
میں قفس کے پاس یوں بیٹھا ہی رہتا پر کھلا

عجلتِ پرواز جب ملنے بھی دے راہ گریز
یوں تو کھلنے کو قفس کا در کھلا اکثر کھلا

بند ہے بابِ قفس۔ ہو۔ سر تو ٹپکے جائیے
ہم نے دیکھا ہے قفس کی تیلیوں میں در کھلا

کم تو کیا صیّاد بے تابی سوا ہو جائے گی
تو نے ناحق تیلیوں میں رکھ دیا خنجر کھلا

آسماں گرم تلافی چاہیئے کیسا قفس
بجلیوں کے اک اشارے میں قفس کا در کھلا

ہجر ساقی میں ہمارے گھر کی کیفیت نہ پوچھ
بند در، ہر شیشہ خالی دل بھرا ساغر کھلا

لکھ چکے ہم جا بجا خط گر یہی حالت رہی
ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

دل میں زخم اشکوں میں خوں صورت یہ بیتا عالم پہ رہا
وہ نگہ اف وہ مژہ ناوک چھپا نشتر کھلا

دم بخود سکتے کا عالم مردنی چھائی ہوئی
رنگ میری زندگی کا میری میت پر کھلا

دیکھئے کیا گل کھلاتی ہے بہار ابکے برس
خواب میں **فانی** نے دیکھا ہے قفس کا در کھلا

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

لیجئے کیا دامن کی خبر اور دست جنوں کو کیا کہیئے

اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی

تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن

غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

حاصلِ علم بشر جہل کا عرفاں ہونا
عمر بھر عقل سے سیکھا کئے ناداں ہونا

چار زنجیرِ عناصر پہ ہے زنداں موقوف
وحشتِ عشق ذرا سلسلہ جنباں ہونا

دل بس اک لرزشِ پیہم ہے سراپا یعنی
تیرے آئینہ کو آتا نہیں حیراں ہونا

فال افزونیٔ مشکل ہے ہر آسانیٔ کار
میری مشکل کو مبارک نہیں آساں ہونا

راحت انجامِ غم اور راحتِ دنیا معلوم
لکھ دیا دل کے مقدر میں پریشاں ہونا

دے ترا حسنِ تغافل جسے جو چاہے فریب
ورنہ تو اور جفاؤں پہ پشیماں ہونا

ہائے وہ جلوۂ ایمن وہ نگاہِ سرِ طور
فتنہ ساماں سے ترا فتنۂ ساماں ہونا

خاک فانی کی قسم ہے تجھے اے دشتِ جنوں
کس سے سیکھا ترے ذروں نے بیاباں ہونا

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گذر گیا
عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا

آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیرانِ زندگی
یعنی جمالِ یار کا صدقہ اُتر گیا

دنیا میں حال آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ
بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

شاید کہ شامِ ہجر کے مارے بھی جی اُٹھے
صبحِ بہارِ حشر کا چہرہ اُتر گیا

آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں
یہ جا رہا ہوں دل ادھر آیا اُدھر گیا

میں نے دیا کہ تم نے لیا دل تمہیں کہو
تم دل میں پہلے آئے کہ دل پیشتر گیا

ہاں سچ تو ہے شکایتِ زخمِ جگر غلط
دل سے گذر کے تیرِ ستمگر کدھر گیا

دل کا علاج کیجئے اب یا نہ کیجئے
اپنا جو کام تھا وہ غمِ یار کر گیا

کیا کہئے اپنی گرمیِ رویہائے شوق کو
کچھ دور میرے ساتھ مرا راہبر گیا

فانی کی ذات سے غمِ ہستی کی تھی نمود
شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

سایہ بھی جس پہ میرے نشیمن کا پڑ گیا
کیوں آسمان باغ ہی سارا اُجڑ گیا

تو نے سب اپنے کام بگڑ کر بنا لئے
میری وفا وہ کام جو بن کر بگڑ گیا

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے
اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا

صیّاد یوں پروں میں گرہ باندھتے ہیں کیا
بیدرد بندِ بند کسی کا جکڑ گیا

ہوتا ہے آج فیصلہ امید و یاس کا
ٹھنتا ہے اب وہ دل جو بسا اور اُجڑ گیا

بنتی نہیں ہے صبر کو رخصت کئے بغیر
کام اُن کی بیقرار نگاہوں سے پڑ گیا

بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ
کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا اُدھڑ گیا

اللہ رے جوشِ بادِ بہاری ترا اثر
پیمانہ لڑکھڑا کے صراحی سے لڑ گیا

وعدے کی رات گردشِ افلاک رُک گئی
جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

اک حشر اور چاہیئے اس روسیاہ کو
فانیؔ زمینِ حشر میں غیرت سے گڑ گیا

اے اجل اے جانِ فانی تو نے یہ کیا کر دیا
مارڈالا مرنے والے کو کہ اچھا کر دیا

جب ترا ذکر آگیا ہم دفعتاً چپ ہو گئے
وہ چھپایا راز دل ہم نے کہ افشا کر دیا

کس قدر بیزار تھا دل مجھ سے ضبطِ شوق پر
جب کہا دل کا کیا ظالم نے رسوا کر دیا

یوں چرائیں اس نے آنکھیں سادگی تو دیکھیے
بزم میں گویا مری جانب اشارہ کر دیا

دردمندان ازل پر عشق کا احساں نہیں
درد یاں دل سے گیا کب تھا کہ پیدا کر دیا

دل کو پہلو سے نکل جانے کی پھر رٹ لگ گئی
پھر کسی نے آنکھوں آنکھوں میں تقاضا کر دیا

بچ رہا تھا ایک آنسو دارو گیر ضبط سے
جوشِ غم نے پھر اس قطرے کو دریا کر دیا

فانیؔ مہجور تھا آج آرزومندِ اجل
آپ نے آ کر پشیماں تمنا کر دیا

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا

برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشر سکوت
تیرے شہید ناز کا ماتم خموش تھا

اُمید عفو ہے ترے انصاف سے مجھے
تنہا بڑا ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

فرمائے حشر خیز سے آنکھوں کا تھا قصور
ہر رُخ مری نگاہ کا تصویر دوش تھا

ہر مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب
عالم دلیل گمرہی چشم و گوش تھا

وحشت بقدر چاک گریباں روا نہیں
دیوانہ تھا جو معتقد اہل ہوش تھا

پی اور وہ پی ازل میں کہ آئے نہ حشر تک
یادش بخیر دل بھی عجب بادہ نوش تھا

محروم یاں ذریعہ الہام ذکر یقیں
نالوں پہ انحصار پیام سروش تھا

فانی تنک بضاعتی غم کا کیا علاج
ہر قطرہ خون دل کا تمنا فروش تھا

خون ناحق کا گلہ تھا کچھ اُن کا جوش تھا
لاش کی صورت زباں تھی اور میں خاموش تھا

نور برق معرفت بخشا دل آگاہ نے
ورنہ پہلے سوز غم اک شعلۂ بیہوش تھا

ہائے کیا دن ہیں کہ نقش سجدہ ہے سر نہیں
یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبال دوش تھا

عشق کی دنیا زمیں سے آسماں تک شوق تھی
تھا جو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا

دل کی ہر کروٹ میں اک دنیا نئی اک مٹ گئی
ہائے ان دو خون کی بوند میں کتنا جوش تھا

سرگزشت عمر کہیے اس کو یا روداد عشق
دیکھے لب جنبش میں تھے اور میں سراپا گوش تھا

کہا یہ قانیؔ کر رہا تھا عالمِ ہستی کی سیر
آگے آگے بیخودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا

خوشی سے رنج کا بدلا یہاں نہیں ملتا
وہ مل گئے تو مجھے آسماں نہیں ملتا

ہزار ڈھونڈیئے اس کا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو آستاں نہیں ملتا

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

بتا اب اے جرسِ دور میں کدھر جاؤں
نشانِ گردِ رہِ کارواں نہیں ملتا

مجھے بلا کے یہاں آکے چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا
یہ راز ہے کہ کوئی رازداں نہیں ملتا

مجھے عزیز سہی قدر دل تمہیں کیوں ہو
کمی تو دل کی نہیں دل کہاں نہیں ملتا

دیارِ عمر میں اب قحط مہر ہے فانیؔ
کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

جلوہ محسوس سہی آنکھ کو آزاد تو کر
قیدِ آدابِ تماشا بھی تو محفل سے اٹھا

پھر تو مضراب جنوں ساز انا لیلےٰ چھیڑ
ہائے وہ شورِ انا لقیس کہ محمل سے اٹھا

اختیار ایک اور تھی مری مجبوری کی
لطفِ سعیِ عمل اس مطلبِ حاصل سے اٹھا

عمرِ امید کے دو دن بھی گراں تھے ظالم

بار فرزانہ ترے وعدہ باطل سے اٹھا

خبرِ قافلہ گم شدہ کس سے پوچھوں
اک بگولہ بھی نہ خاکِ رہِ منزل سے اٹھا

ہوش جب تک ہے گلا گھونٹ کے مر جانے کا
دمِ شمشیر کا احسان ترے بسمل سے اٹھا

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آسان نہ اُٹھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا

کس کی کشتی تہہ گردابِ فنا جا پہونچی
شورِ لبیک جو فانیؔ لبِ ساحل سے اٹھا

نذرِ دردِ دلِ غمِ دُنیا کیا — ایک مٹایا داغ اک پیدا کیا
رونمائے جوشِ حیرت تھی نگاہ — آئینہ مُنھ آپ کا دیکھا کیا
بجلیاں بھر دیں نگاہِ یار میں — تو نے آہِ آتشیں یہ کیا کیا
وسعتِ دل تھی بقدرِ دادِ عشق — قطرہ دریا تھا جسے دریا کیا

نالہ کیا ہاں اک دھواں سا شامِ ہجر
بستر بیمار سے اُٹھا کیا

سخت نازک تھا مزاجِ دردِ عشق
دل فدائے حُسن بے پروا کیا

زیست تھی بے کار فانی دل کے بعد
جان بھی قربان کی اچھا کیا

جمال خود رُخ بے پردہ کا نقاب ہُوا
نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہُوا

ملا ازل میں مجھے میری زندگی کے عوض
وہ ایک لمحہ ہستی کہ صرف خواب ہُوا

سکونِ قلب میسّر ہے موت ہی سے سہی
غرض کہ خاتمۂ رنجِ اضطراب ہُوا

وہ جلوہ مفت نظر تھا نظر کو کیا کہیے
کہ پھر بھی ذوقِ تماشا کامیاب ہُوا

اُلٹ گئی مری امید و بیم کی دُنیا
یہ کیا نظامِ تمنّا میں اِنقلاب ہُوا

گناہگار سہی دل مگر قصور معاف
ظہورِ شوق بہ اندازۂ حجاب ہُوا

قضا کو مژدۂ فرصت کہ فانی مہجور
شہید کشمکشِ صبر و اضطراب ہُوا

جلوۂ عشق حقیقت تھی حُسنِ مجاز بہانہ تھا
شمع جسے ہم سمجھتے تھے شمع نہ تھی پروانہ تھا

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

عہد جوانی ختم ہوا اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
ہم بھی جیتے تھے جب تک مر جانے کا زمانہ تھا

دل اب دل ہے خدا رکھے ساقی کو میخانے کو
ورنہ کسے معلوم نہیں ٹوٹا سا پیمانہ تھا

فانیؔ گو گیا ہی سہی پھر بھی تجھی سے نسبت تھی
دیوانہ تھا۔ تھا کس کا تیرا ہی دیوانہ تھا

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہمیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

دل ہے تری نگاہ تک جان ہے ایک آہ تک
حوصلۂ امید کیا ظرف امیدوار کیا

محو فروغ ذات ہوں بے خبر صفات ہوں
کوئی ہو شمع بزم کیا شمع سر مزار کیا

پرسش سے احتراز کر فاش نہ غم کا راز کر
وعدۂ حساب کیوں شکوۂ روزگار کیا

حد سے سوا جفا سہی مجھ پہ ہے غیر پہ نہیں
جوشش سیل گریہ کون ضبط کو ناگوار کیا

جو غم بے اثر نہ ہو جو شب بے سحر نہ ہو
وہ غم انتظار کب وہ شب انتظار کیا

اپنے کمال شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدہ جب چاہیے زحمت انتظار کیا

کھیل تھا سب امید کا بن نہ رہی تو کچھ نہ تھا
آرزوؤں کی کیا بساط شوق کا کاروبار کیا

بہار اپنی چمن اپنا قفس کی تیلیوں تک ہے
مبارک نکہتِ گل کو چمن بردوش ہو جانا

خدا دشمن کو بھی یہ خوابِ حسرت بھی نہ دکھلائے
ابھر آنا پئے پرسش اور پھر خاموش ہو جانا

قیامت ہے یہ ٹکڑا داستانِ عشق کا یعنی
مرے راحت طلب دل کا اذیت کوش ہو جانا

مرقع ہے کسی کی ہستیِ موہوم کا فانی
وہ ان کا دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو جانا

جلوہ گاہِ نازِ جاناں جب مرا دل ہو گیا
سامنا فانی مجھے دل کا بھی مشکل ہو گیا

فرقتِ گیسو سے تنہائی کے قابل ہو گیا
دل پہ جب تیری نگاہیں جم گئیں دل ہو گیا

کر کے دل کا خون کیا کیا بیاں کم ہو گئیں
جو لہو آنکھوں سے دامن پر گرا دل ہو گیا

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لیکر کوئی غافل ہو گیا

طور پر تو نے تجلی کر ہزاروں طور پیدا کر دئے
ذرہ ذرہ میرے دل کی خاک کا دل ہو گیا

موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا

دردِ فرقت کی خلش وابستۂ انفاس تھی
مدعائے زندگانی مر کے حاصل ہو گیا

دل مرا بادرد تھا وہ ابتدائے عشق تھی
انتہا یہ ہے کہ فانی درد اب دل ہو گیا

یاں ہوش سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا
اس بزم میں ہشیار ہوا بھی نہیں جاتا

کہتے ہو کہ ہم وعدہ پرستش نہیں کرتے
یہ سُن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا

دشواریِ انکار سے طالب نہیں ڈرتے
یوں سہل تو اقرار ہوا بھی نہیں جاتا

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت
احباب سے غمخوار ہوا بھی نہیں جاتا

جاتے ہوئے کھاتے ہو مری جان کی قسمیں
اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا

غم کیا ہے اگر منزلِ جاناں ہے بہت دور
کیا خاکِ رہِ یار ہوا بھی نہیں جاتا

دیکھا نہ گیا اُس سے تڑپتے ہوئے دل کو
ظالم سے جفا کار ہوا بھی نہیں جاتا

یہ طرفہ ستم ہے کہ ستم بھی ہے کرم بھی
اب خوگرِ آزار ہوا بھی نہیں جاتا

---

سرِ ہوش برق گرتی وہ ہجومِ ناز ہوتا
وہ نظر فریب جلوہ جو نظر نواز ہوتا

خبر اپنی مغفرت کی تو نہیں چاہتا ہوں
مری توبہ چاہتی ہے درِ توبہ باز ہوتا

مرے شوق نے سکھایا اُسے شیوۂ تغافل
نہ مجھے نیاز ہوتا نہ وہ بے نیاز ہوتا

---

وحشتِ عشق نے ہوش میں لانا چاہا
عقل کم فہم نے دیوانہ بنانا چاہا

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر
پھر کچھ اے بےخبری تجھ میں کمی ہوتی ہے

موت نے عمرِ دو روزہ کا بہانہ چاہا
درد نے کیا مجھے پھر ہوش میں لانا چاہا

---

تری ترچھی نظر کا تیر مشکل سے نکلیگا
دل اسکے ساتھ نکلیگا اگر یہ دل سے نکلیگا

شبِ غم میں بھی میری سخت جانی کو نہ موت آئی
ترا کام اے اجل اب خنجرِ قاتل سے نکلیگا

نگاہِ شوق میرا مدعا تو ان کو سمجھا دے
مرے منہ سے تو حرفِ آرزو مشکل سے نکلیگا

کہاں تک کچھ نہ کہئے اب تو نوبت جان تک پہنچی
تکلف برطرف اے ضبط نالہ دل سے نکلیگا

تصور کیا ترا آیا قیامت آگئی دل میں
کہ اب ہر ولولہ باہر مزارِ دل سے نکلیگا

نہ آئینگے وہ تب بھی نکل ہی جائیگا فانی
مگر مشکل سے نکلے گا بڑی مشکل سے نکلے گا

جگر خراش ہے حال اُن تباہ حالوں کا
جنہیں مٹا کے رہا حوصلہ خیالوں کا

کیا سوال تو آوازِ بازگشت آئی
جواب مجھ سے طلب ہے مرے سوالوں کا

جنونِ شکوۂ بیداد پر خدا کی مار
اثر کے ساتھ گیا اعتبار نالوں کا

تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

کسی کی غم کی کہانی ہے زندگی **فانیؔ**
زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا

حجاب اگر حسن و تو کا نہ درمیاں ہوتا
پیام حسن محبت کی داستاں ہوتا

تری تلاش کا افسانہ گر بیاں ہوتا
رہِ مجاز کا ہر ذرّہ اک زباں ہوتا

وجود ہے میری نگاہ خود نشناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا

کمال ضبط غم عشق لے معاذ اللہ
کہیں کہیں سے جو یہ ماجرا بیاں ہوتا

بنائے جلوہ گہ ناز ہے جبینِ نیاز
جو درد عشق نہ ہوتا تو دل کہاں ہوتا

تمام قوتِ غم صرف دل ہوئی ورنہ
زمیں زمیں ہی نہ ہوتی نہ آسماں ہوتا

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار
نہ موج بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز
کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا

مٹا دیا غمِ فرقت نے ورنہ میں **فانیؔ**
ہنوز ماتمیِ مرگِ ناگہاں ہوتا

محتاجِ اجل کیوں ہے خود اپنی قضا ہو جا
غیرت ہو تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا

اے شوقِ طلب بڑھ کر مجنوں ادا ہو جا
اے ہمتِ مردانہ راضی برضا ہو جا

آغوشِ فنا میں ہم پروردۂ آفت ہیں
اے فتنۂ دوراں اٹھ اے حشر بپا ہو جا

ضد اور ضد اے دل اچھا تو خدا حافظ
قربان ہی اس بت پر ہوتا ہے تو جا ہو جا

اس جانِ تمنا سے بے پردہ نہ شکوہ کر
وہ تجھ سے خفا ہے تو جینے سے خفا ہو جا

ہر قافلۂ دل کو تو مژدۂ منزل دے
ہر جگہ رہِ غم میں نقشِ کفِ پا ہو جا

یہ دردِ محبت بھی کیا شے ہے معاذ اللہ
میں دردِ محبت سے کہتا ہوں سوا ہو جا

ظالم کا نہ شکوہ کر مظلوموں کی نہ پروا کر
تو اپنی وفاؤں کی عزت پہ فدا ہو جا

اس ہستیٔ فانی سے کر قطعِ نظر فانی
تو دوست کا طالب ہے دشمن سے جدا ہو جا

## ردیف ب

پھر دل بنا ہے آرامِ جانِ اضطراب
پھر تمنا ہے کسی کی میہمانِ اضطراب

ہم مُوئے جاتے ہیں فانیؔ آہ کی تاثیر کے — اُس نے کیا کیا کہہ کر بڑھا دی آج شانِ اضطراب

کب ہے آغوشِ لحد میں ہم ہیں سر تا پا قرار — وہ ستم پرور ہے اب تک بدگمانِ اضطراب

مجھ کو مضطر دیکھ کر اُن کو حجاب آنے لگا — ہو چلی ہیں وہ نگاہیں راز دانِ اضطراب

اشک اک اک کر کے سب آوارہ دامن ہو گئے — رفتہ رفتہ مٹ گیا نام و نشانِ اضطراب

وقتِ عرضِ حالِ دل اس فکر نے مارا مجھے — کیجئے آغاز کیوں کر داستانِ اضطراب

اضطرابِ دل کے شکووں نے کیا اُلٹا اثر — بے نیازِ نطق ہے گویا زبانِ اضطراب

رازِ ضبطِ غم الٰہی کس نے افشا کر دیا — ہے اُنھیں میری خموشی پر گمانِ اضطراب

سینۂ فانیؔ ہے یا جولانگہِ برقِ فنا
دل ہے یا رب یا بلائے آسمانِ اضطراب

عشق ہے پرتوِ حسنِ محبوب — آپ ہی اپنی تمنا کیا خوب

طلبِ محض ہے سارا عالم — کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب

قلب اور اک دماغ اور حواس
مجھ سے منسوب ہیں تجھ سے مغلوب

# ردیف د

فغاں کے پردے میں سن لو مری داستاں صیاد
کہ پھر رہے نہ رہے طاقتِ بیاں صیاد

ترا اشارہ ترا ساز برق سے نہ سہی
تجھے خبر ہے کہ جلتا ہے آشیاں صیاد

نہ آ قریب کہ پروردۂ فنا ہوں میں
بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیاد

بس ایک آہ جہاں سوز کے اثر تک ہیں
یہ خار برقِ قفس دام آسماں صیاد

نکل ہی جائینگے نالے دہن سے خوں ہو کر
زباں نہیں تو کھلے گی رگِ زباں صیاد

ستم رسیدۂ آوازۂ بیاں ہوں میں
قفس میں کیا کھینچ کے لائی مری زبان صیاد

چمن میں دل ہے تو میری نگاہ میں ہے چمن
چمن سے تو مجھے لیجائیگا کہاں صیاد

یہ جذب ذوقِ اسیری کا ہے ورنہ اے فانی
کہاں میں سوختہ دل مست پر کہاں صیاد

کیا کہیے کہ بیداد ہے تیری بیداد
طوفانِ محبت کی ہے زد میں فریاد

دل محشرِ بے خودی ہے اللہ اللہ
یاد اور کسی بھول جانے والے کی یاد

پابندیٔ رسم ہر طرف کیوں اے موت
اُن کے بھی کئے ہیں تو نے قیدی آزاد

اللہ یہ بجلیاں نہ کام آئیں گی
آندھی ہی سے کیوں ہو آشیانہ برباد

دنیا جسے کہتا ہے زمانہ فانیؔ
ہے ایک طلسم اجتماعِ اضداد

# ردیف ر

حیراں ہوں رنگ عالمِ تصویر دیکھ کر
کیا یاد آ گیا مجھے زنجیر دیکھ کر

قسمت کے حرف سجدۂ در سے مٹا تو دوں
دل کانپتا ہے شوخیٔ تدبیر دیکھ کر

ہے بے وہ اہلِ ذوق کی زنداں نوازیاں
سر پیٹتا ہوں خانۂ زنجیر دیکھ کر

وہ بیوفا جفا سے بھی اب آشنا نہیں
کیا منفعل ہوں آہ کی تاثیر دیکھ کر

فانیؔ وداعِ ہوش بھی کرنا پڑا مجھے
تن سے وداعِ روح میں تاخیر دیکھ کر

عشق عشق ہو شاید حسن میں فنا ہو کر
انتہا ہوئی غم کی دل کی ابتدا ہو کر

دل میں ہُوا حاصل ورنہ ہیں فنا ہو کر — عشق میں کیا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر

نامراد ہے تک نامراد جیتے ہیں — سانس بن گیا ایک نالۂ نارسا ہو کر

اب ہوئی زمانہ میں شیوۂ وفا کی قدر — عالم آشنا ہے وہ دشمنِ وفا ہو کر

اور نکلے ہیں جنکو دعویٰ خدائی ہے — تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر

بندۂ غلائی ہے مدعی خُدائی کا — نکلے نے خدائی کی بندۂ خُدا ہو کر

عمر خضر کے انداز ہر نفس میں پاتا ہوں — زندگی نئی پائی آپ سے جُدا ہو کر

بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں — درد پے خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

کارگاہ حسرت کا حشر کیا ہُوا یا رب — داغ دل پہ کیا گذری نقش مدعا ہو کر

عشق سے ہوئے آگاہ صبر کی بھی حد دیکھی — خاک میں ملا دو گے دیر آشنا ہو کر

کی قضائے مبرم نے زندگی کی غمخواری — درد کی دوا پہنچی درد بے دوا ہو کر

زندگی سے ہو بیزار فانی اس سے کیا حاصل
موت کو منا لو گے جان سے خفا ہو کر

کرنہ فریاد خموشی میں اثر پیدا کر — درد بن کر دل بیدرد میں گھر پیدا کر

میں دعا موت کی مانگوں تو اثر پیدا کر
ورنہ یارب شب فرقت کی سحر پیدا کر

تہ میں جا سطح سے تو قطع نظر کر دیکھ
قطرے قطرے میں سمندر کی نظر پیدا کر

جتنے غم چاہے دئے جا مجھے یارب لیکن
ہر نئے غم کے لئے تازہ جگر پیدا کر

یا اسے کر کسی بجلی کے حوالے یارب
یا مرے نخل تمنا میں ثمر پیدا کر

---

دل مایوس کو اے عہد کرم شاد نہ کر
ناز پروردۂ غم ہے اسے برباد نہ کر

اے تقاضائے خرد مجھ پہ یہ بیداد نہ کر
میں ہوں دنیائے محبت مجھے برباد نہ کر

روح ارباب محبت کی لرز جاتی ہے
تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

غم ہستی ہی سہی تیرے سوا کوئی ہو
دل کہ بستی ہے تری غیر سے آباد نہ کر

خامشی عین فغاں ہونے نہ پائے آ دل
اور جو فریاد ہی کرنا ہے تو فریاد نہ کر

صبر شایانِ محبت تو نہیں ہے لیکن
شکر اگر بن نہ پڑے شکوہ بیداد نہ کر

دل کی حد سے اثر زیست نہ گذرے فانیؔ
ہوش لازم ہے مگر ہوش کو آزاد نہ کر

# ردیف ز

کون اُٹھائے مری وفا کے ناز
دل ستم دوست وہ رقیب نواز

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز
میں ہی تھا ایک دُکھ بھری آواز

کھُل گیا میری زندگی کا راز
اے شبِ ہجر تیری عمر دراز

طور و منصور و طور ارے توبہ
ایک ہے تیری بات کا انداز

دیکھئے کیا ہو عشق کا انجام
دل کی ہستی ہے موت کا آغاز

رہ گئی تھی جو بازوؤں میں سکت
ہو گئی صرف ہمت پرواز

آج روز وصال فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

دور لے جا ہٹا کے سرحدِ ناز
دل ہے آوارۂ حدود نیاز

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم
میری ہستی ہے غیب کی آواز

ہوں اسیرِ فریبِ آزادی
پر ہیں اور شوقِ حیلۂ پرواز

آج اچھے نہیں الٰہی خیر — درد کے تیور آہ کے انداز

کیوں فلک! انتہا ہوئی کہ نہیں — ایک دم رہ گیا ہے اب دمساز

ہے کوئی شے تو یار وجلوہ یار — یہ حقیقت ہے اور یہ اصل مجاز

ہاں یہاں کوئی شے نہیں حائل — عشق ہے رازِ عقل پردۂ راز

اپنی صبر آزما نظر کو سنبھال — ہم ہیں مجبور آہ صبر گداز

جانِ فانی ترے کرم پہ نثار
تو لے بخشی حیاتِ مرگ نواز

اللہ اللہ یہ شانِ کشتۂ ناز — ہے مری خاک سجدہ گاہِ نماز

ہاں شبِ ہجر آج صبح نہ ہو — ہاں چلی جائے یا دو زلفِ دراز

دھیان تیرا بہشت شوق سہی — دل عاشق ہے ایک دو رخ راز

چشم حاسد مجھے نہ دیکھ سکی — ہوں دلیلِ بلندیٔ پرواز

آج پہلو میں کیوں ہے سناٹا — کیا ہوئی آہ آہ کی آواز

راس آئے ہیں اشک و آہ کسے — کر نہ آب و ہوائے غم سے ساز

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے — تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز
ہم ہیں اور عزمِ آشیاں یعنی — رہ گئی دور طاقتِ پرواز

ہے کہ فانی نہیں ہے کیا کہیے
راز ہے بے نیازِ محرمِ راز

# ردیف ش

دل چُرا کر نگاہ ہے خاموش — ہوش اور مست ہو کے اتنا ہوش
مست کو چاہیے بلا کا ہوش — خم دیئے اور دیا دہ اذنِ خروش
ہر مسافر سے پوچھ لیتا ہوں — خانہ برباد ہوں کہ خانہ بدوش
ہوں جلوہ اور نظر! غافل — کہ نظر ہے صلائے جلوہ فروش
شاید اب منزلِ عدم ہے غریب — یاد خاکِ وطن ہے طوفاں جوش
فضل تیرا شفیع طاعت و زہد — عدل عاصی نواز عصیاں پوش

ہجر نے کی مفارقت فانی
لے مبارک ہو موت کا آغوش

برہم ہے میری ذات سے سارا نظامِ عیش
ٹوٹا ہے میرِ عہد میں نیرنگِ نامِ عیش
اب احتیاجِ شکوۂ اختر نہیں مجھے
مینائے خونِ عیش سے بھرتا ہوں جامِ عیش
گلشن صلائے عام اسیری ہے سر بسر
پھیلا دیا بہار نے پھولوں پہ دامِ عیش

---

میں ہوں اک مرکزِ ہنگامۂ ہوش و رم ہوش
دل اگر عالمِ ہستی ہے تو سر عالمِ ہوش
عدمِ ہوش پہ ہے فطرتِ ہستی مائل
کس توقع پہ اُٹھائے کوئی نازِ غمِ ہوش
بیخودی مایۂ عرفانِ خودی ہے یعنی
محرمِ جلوۂ اسرار ہے نامحرمِ ہوش

کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز
یہ ترا عالمِ ہستی وہ ترا عالمِ ہوش

مظہرِ ہستی و خلّاقِ عدم ہے میری ذات
کچھ نہ تھا ورنہ بجز سلسلۂ برہمِ ہوش

عجب اک سانحۂ ہوش ربا تھی وہ نگاہ
میں ہوں اک عمر سے فانی ہمہ تن ماتمِ ہوش

# ردیف غ

لبِ منزلِ فغاں ہے نہ پہلو مکانِ داغ
دل رہ گیا ہے نام کو باقی نشانِ داغ

اے عشق خاکِ دل پہ ذرا مشقِ فتنہ گر
پیدا کر اس زمیں سے کوئی آسمانِ داغ

دل کچھ نہ تھا تمہاری نظر نے بنا دیا

دُنیائے درد عالمِ حسرت جہانِ داغ
پہلے اجل کو رخصتِ تلقین صبر دے
پھر آخری نگاہ سے سن داستانِ داغ

وہ تیری بزم تھی نہ ملی جس میں چُپ کی داد
یہ حشر ہے یہاں تو کھلے کی زبانِ داغ

ہم سادہ دل ہیں خوش کہ ہوئی نذرِ دل قبول
اُس بدگمان کو مدِ نظر امتحانِ داغ

سارا ملال پیار کی نظروں سے مٹ گیا
ان رہزنوں نے لوٹ لیا کارروانِ داغ

فانی زمین گورِ غریباں ہے لالہ زار
پھر فصلِ گل میں خاک ہوئی ترجمانِ داغ

## ردیف گ

سیکھے دل کے چھیننے کے ڈھنگ — نہ گئی دل کے ساتھ دل کی امنگ

دل ہے اور سحر سازی اور راگ — آنکھ ہے اور فریب گردشِ رنگ

تیغ قاتل تری دُہائی ہے — میری موت اور یہ دستبرد درنگ

دین و دنیائے دیدہ و دل ہیں — بزم صد رنگ و جلوۂ بیرنگ

شمع ہوں بے نیازِ ظلمت و نور — آئینہ ہوں بغیر صیقل و زنگ

میں ہوں عالم کو بیدلی کا پیام — خیرہ چشمہ مدعا نہ صلح نہ جنگ

راز نیرنگئ حقیقت ہوں
میں ہوں فانی حقیقت نیرنگ

## ردیف م

وادئ شوق میں وارفتہ رفتار ہیں ہم — بیخودی کچھ تو بتا کس کے طلبگار ہیں ہم

ہاں الٰہی بخبرِ لذتِ آزار ہیں ہم — مژدہ اے شوقِ ستم تازہ گرفتار ہیں ہم

ہو غمِ ہستی جاوید گوارا کیوں کر — جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم

میں نے گویا صلۂ جور و جفا بھر پایا — کاش اتنا ہی وہ کہہ دیں کہ جفاکار ہیں ہم

حسن حیرت تو میسر ہے تماشا نہ سہی — تیری محفل میں ہیں گو نقش بدیوار ہیں ہم

یوں تو کچھ غم سے سروکار نہ راحت کی تلاش — غم کوئی دل کی عوض دے تو خریدار ہیں ہم

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

کیا کہیں کیوں خاموش ہوئے ہیں سن کے تری فرقت کی خبر ہم
نا کرسول کے جتنے تھے اجزا ہو گئے سارے درہم و برہم

گو بیٹھے بھی اور اٹھے بھی ہم محفل دشمن میں تیری خاطر
بیٹھ گئے دل زار کی صورت اٹھے صورت درد جگر ہم

شکوۂ جور بتاں ہم کرتے ظاہر درد نہاں ہم کرتے
مانا آہ و فغاں ہم کرتے لاتے کہاں سے تجھ کو اثر ہم

کوئی گھڑی اے بیخودیٔ غم دم لینے دے سنبھلنے دے
آ کوئی دم اے ہوش کہ تجھ سے پوچھیں گے کچھ اپنی خبر ہم

دوست تسلی دینے آئے لے کے دوائیں چارہ گر آیا

لیجئے آئی زخمِ جگر پر اور اک تازہ آفت مرہم
ڈوب ہی جا اے کشتیِ ہستی کچھ تو ہو آخر ورنہ کہاں تک

بحرِ تلاطم خیز جہاں میں یوں ہیں رہیں . . . زیر و زبر ہم
گھڑیاں اپنی عمر کی ہم نے غنچوں میں چل پھر کے گذاریں
آئے تھے فانی باغِ جہاں میں گویا مثلِ نسیمِ سحر ہم

زندگی کا ہے امتحاں انجام خدرائے آہ الاماں انجام
تیرے گھر کی زمیں اے توبہ ذرہ ذرہ ہے آسماں انجام
حسن ہے جاوداں بے آغاز عشق آغاز جاوداں انجام
طبعِ نازک پہ بار اک حرف حال دل حرف داستاں انجام
اور جو مل جائے دل سے دل یارب ایک دل کا ہے دو جہاں انجام
کم نہ تھی عمر اک نظر کے لئے عشق تھا مرگِ ناگہاں انجام

پوچھتے ہو نشاں فانی کیا
وہ ہے اک قبر بے نشاں انجام

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

ہُوا نہ راز رضا فاش وہ تو یہ کہیے
مرے نصیب میں تھی ورنہ سعی نامعلوم

دعا تو خیر دعا سے اُمید خیر بھی ہے
یہ مدعا ہے تو انجام مدعا معلوم

# ردیف ن

مری آنکھوں سے بہنا چاہیئے دل کا لہو برسوں
رہی ہے اُن کو خونِ آرزو کی آرزو برسوں

جیئے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

نگاہوں نے دلوں میں دل نے آنکھوں میں تجھے ڈھونڈا
تیری دُھن میں رہے سودائیانِ جستجو برسوں

نقاب جلوہ کی کایا پلٹ دی شوق بیجد نے
مری وحشت نے توڑا ہے طلسمِ رنگ و بو برسوں

تری ایذا پسندی کی ادا بھی کیا قیامت ہے
مجھے مرنے نہ دے گی آرزوئے مرگ تو برسوں

ہماری بیکسی کی موت بدلہ تھی اسیری کا
رہا طوقِ اسیری بھی گرفتارِ گلو برسوں

کئے جائیں گے دل کے خاتمہ پر شکر کے سجدے
وفاؤں نے کیا ہے خون حسرت سے وضو برسوں

نہ چھیڑ اے نامرادی خستۂ اُمیدِ باطل ہوں
رہا ہے چاک دل آزردۂ مشقِ رفو برسوں

تجھے اور حال دل سے یہ تجاہل توبہ کر توبہ
کہ تجھ سے میری خاموشی نے کی ہے گفتگو برسوں

مری اِک عمرِ فانی نزع کے عالم میں گذری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

اور نہ جانتا ہوں فریبِ نظر کو میں
دیکھوں اُلٹ کے پردہ داغِ جگر کو میں

ہر نقشِ پا کو دیکھ کے دُھنتا ہوں سر کو میں
پہچانتا نہیں ہوں تری رہگذر کو میں

عہدِ خزاں میں فتنۂ آشوبِ ہوش ہوں
بھولا ہوا ہوں موسمِ دیوانہ گر کو میں

گم کردہ راہ ہوں قدمِ اولیں کے بعد
پھر راہبر مجھے نہ ملا، راہبر کو میں

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو
پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

مایوسِ انتظار ہوں مجنوں اضطراب
ہنستا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں

بہلا نہ دل نہ تیرگیِ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

وہ تین ہچکیوں میں دمِ نزع کہہ گیا
شرحِ درازِ زندگیِ مختصر کو میں

فانیؔ دعائے مرگ کی فرصت نہیں مجھے
یعنی ابھی تو ڈھونڈ رہا ہوں اثر کو میں

خراب لذتِ دیدارِ یار ہم بھی ہیں
تمہی شریکِ دلِ بیقرار ہم بھی ہیں

نہ دن کو چین نہ راتوں کو تیری طرح اداس
جلے ہوئے تو چراغِ مزار ہم بھی ہیں

اُمیدِ مرگ ہے باقی تو نااُمید نہیں
کہ اپنی وضع کے اُمیدوار ہم بھی ہیں

کسی کی بزمِ طرب میں کچھ ایک شمع نہیں
حریفِ گریۂ بے اختیار ہم بھی ہیں

ادھر بھی دیدۂ عبرت نگاہ ایک نظر
کہ عہد شوق کی اک یادگار ہم بھی ہیں

یہاں بھی ہے دل آگاہ وقف لذت درد
خراب مستی عشق خمار ہم بھی ہیں

زمین گور غریباں پہ اک جگہ نہ ٹھہر
یہیں کہیں نگہ شرمسار ہم بھی ہیں

حجاب ہوش اٹھا اب کوئی حجاب نہیں
خیال یار سے اب ہمکنار ہم بھی ہیں

جنوں نے دی ہمیں راحت وگرنہ اے فانیؔ
نشانۂ الم روزگار ہم بھی ہیں

خود مسیحا خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں
زخم دل پیدا کریں یا زخم دل اچھا کریں

دل رہے آلودہ دامن اور ہم دیکھا کریں
آج اے اشک ندامت آ۔ تجھے دریا کریں

جسم۔ آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی

موسمِ گل آگیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں
جابجا تغیر حال دل کے چرچے ہیں تو ہوں
ہم ہوئے رسوا مگر اب ہم کسے رسوا کریں
ہاں نہیں شرطِ مروت حسرتِ تاثیر درد
رحم آ ہی جائے گا اُن سے تقاضا کیا کریں
شوق نظارہ سلامت ہے تو دیکھا جائے گا
ان کو پردہ ہی اگر منظور ہے پروا کریں
ظرف ویرانہ بقدر ہمت وحشت نہیں
لاؤ ہر ذرہ میں پیدا وسعتِ صحرا کریں
مرگ بے ہنگام فانی وجہ تسکین ہو چکی
زندگی سے آپ گھبراتے ہیں گھبرایا کریں
مر کر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں
ہم جان دیکے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

بیزار ہو نہ جائے کہیں زندگی سے دل
تاثیر سے خفا مرے نالے ہوئے تو ہیں

ہاں دردِ عشق اُن پہ کرم کی نظر رہے
صبر و قرار تیرے حوالے ہوئے تو ہیں

یہ صحبتیں بھی دیکھئے لاتی ہیں رنگ کیا
مہمانِ خار پانوں کے چھالے ہوئے تو ہیں

کیا جانئے کہ حشر ہو گیا صبحِ حشر کا
بیدار تیرے دیکھنے والے ہوئے تو ہیں

فانیؔ ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

فصلِ خبر بڑھا گئے عمر کے بابِ راز ہیں — یادِ وصالِ مختصر دل کے شبِ دراز ہیں
جلوۂ اختیار سے نسبتِ جبر ہے مجھے — شعلۂ آرمیدہ ہوں وادیٔ برق ناز ہیں
بے اثری مجھے قبول ایسے اثر کو کیا کروں — اب نہ خدا اثر نہ دے آہ اثر گداز ہیں

ہم نہ ازل سے آج تک سجدے سے سر اٹھا سکے
چھپ رہے جلوہ ہائے دوست کعبۂ حریم ناز میں

حشر میں حشر چاہیے حشر پہ حشر چاہیے
دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیۂ نیاز میں

چشم براہ یار ہوں منتظر فشار ہوں
سبزۂ رہگذار ہوں عالم عرض ناز میں

چارۂ تپ فراق کا شکر نہیں تو کچھ نہیں
بوئے مزاج یار ہے نبض بہانہ باز میں

عالم درد کا نظام آ کے ذرا الٹ نہ دو
عشق سے فرق آ گیا حسن کے امتیاز میں

زہر ہے یاد وائے دل وہ ہیں کہاں موت ہے قریب
رعشہ مری نظر میں ہے یا الف چارہ ساز میں

فانیؔ زار کا ہوا جبر سے خاتمہ بخیر
عمر تمام ہو گئی عشق کے سوز و ساز میں

فرقت میں نار اشک ہے ہر تار آستیں
ہر داغ خوں ہے دیدۂ خونبار آستیں

رکھ پنجۂ جنوں سے سروکار آستیں
کب تک رہیں گے ہاتھ گرانبار آستیں

کل تک جو ہاتھ خیمۂ چراغ جنوں رہا
ہے آج فرط ضعف سے آزار آستیں

انبار آنسوؤں کے ہیں خون جگر کے ڈھیر
معمور ہے خزانۂ سرکار آستیں

---

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

بے ادب گریۂ محرومیٔ دیدار نہیں
ورنہ کچھ در کے سوا حاصلِ دیوار نہیں

آسماں بھی ترے کوچہ کی زمیں ہے لیکن
وہ زمیں جس پہ ترا سایۂ دیوار نہیں

ہائے دنیا وہ تری منتظر تقاضا آنکھیں
کیا مری خاک کا ذرّہ کوئی بیکار نہیں

---

جو تابِ دلنوازیٔ درماں نہ لا سکے
میں ہوں وہ دردِ غم کدۂ روزگار میں

ہے عکس روئے دوست پہ اک پرتو مجاز
میری نظر بھی کھنچ گئی تصویرِ یار میں

دعوے یہ ہے کہ دوریٔ معشوق ہے محال
مطلب یہ ہے کہ قرب نہیں اختیار میں

قرباں اک ادائے تغافل پہ لاکھ بار
وہ زندگی جو صرف ہوئی انتظار میں

---

لاؤ کچھ تکملۂ شوق کا ساماں کر لیں
دلِ بیتاب کو بھی دیدۂ حیراں کر لیں

ہر نفس وقفِ خیالِ رخِ جاناں کر لیں
زندگی ہجر میں دشوار ہے آساں کر لیں

دادِ مظلوم نگاہی بھی تو لے لینے دے
ٹھہر اے موت کہ قاتل کو پشیماں کر لیں

# ردیف و

آل سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

چلے بھی آؤ وہ ہے قصرِ فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

ابھی کیا ہے کسی دن خون رلائیگی یہ خاموشی
زبانِ حال کی جادو بیانی دیکھتے جاؤ

غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

ادھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو ادھر دیکھو
مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

بہارِ زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھو گے

کسی کا عیش مرگِ ناگہانی دیکھتے جاؤ
سُنے جانے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میت پر
اب اُٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

اب آنکھ اُٹھتی ہے وہ جنبش ہوئی ہلکی سی مژگاں کو
وہ چھیڑا چاہتے ہیں نوکِ نشتر سے رگِ جاں کو
بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کو
گریباں نے گلے لپٹا لیا ہے بڑھ کے داماں کو
مرے تلوؤں سے کانٹوں پر نئی گلکاریاں ہونگی
مری وحشت مبارک ہو جنونِ عیش ساماں کو
بیاباں کو یہاں لے آئے تھے کچھ خاک کے ذرّے
یہی ذرّے اُڑا لے جائیں گے اک دن بیاباں کو

نہ آیا موسمِ گل جب دلِ دیوانہ جیتا تھا
جواب آئے تو یارب آگ لگ جائے گلستاں کو

چھٹے جب قیدِ ہستی سے تو آئے کنجِ تربت میں
رہا ہوتے ہیں یعنی ہم بدل دیتے ہیں زنداں کو

خدا غارت کرے دل کو بڑی مشکل میں ڈالا ہے
نہ سمجھا عمر بھر ناداں فریبِ عشق آساں کو

نظر سے جب ملی اُن کی نظر دل میں اُتر آئی
ہم آنکھوں سے لگا کر دل میں رکھ لیتے ہیں پیکاں کو

دلِ فانیؔ سے گو نکلی مگر آساں نہیں نکلی
عجب شے تھی خدا بخشے اُمیدِ وصلِ جاناں کو

اثر پابندِ بیتابی نہیں تو ضبط بھی کیوں ہو
بلا سے حال دل کچھ بھی سہی ناگفتنی کیوں ہو

خدا رکھے محبت کو نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
اجل کہتے ہیں جس کو وہ ہماری زندگی کیوں ہو

ستم کا لطف بھی ہے امتیازِ لطف کے دم تک
کرم بھی کیوں نہ ہو بیداد گر بیداد ہی کیوں ہو

ٹھکانا ہے سرِ تقدیر پر خونِ ناحق کا
تری تلوار پہ یہ خون بیٹھی ہوئی کیوں ہو

لگا یاس کو روداد حسرت کہہ تو لینے دے
ترے دل کو لگے ظالم وہی لگی لگی کیوں ہو

ہماری بیخودی سمجھے آداب الفت ہے
کسی کو دیکھ کر دل آشنا لگی کیوں ہو

کسی کی یاد بھی لپٹی ہوئی ہے دامنِ دل سے
مری میت پہ **فانی** نوحہ گر اک بیکسی کیوں ہو

# ردیف ھ

تو جانِ مدعائے دل اور دل جگہ جگہ
ہے ایک شمع رونقِ محفل جگہ جگہ

حسرت جُدا امید جدا آرزو جدا
دُنیائے دل میں ہیں ترے بسمل جگہ جگہ

مٹ کر بھی داغ شاہدِ خونِ شہید ہے
دھویا ہُوا ہے دامنِ قاتل جگہ جگہ

تو نے فراقِ دل ہمیں دیوانہ کر دیا
پھرتے ہیں پوچھتے خبرِ دل جگہ جگہ

رو رو کے ایک ایک قدم بڑھ رہا ہوں میں
ہنستی ہے مجھ پہ دوریِ منزل جگہ جگہ

غم اہلِ کائنات ہے دل جوہرِ حیات
دل غم سے غم ہے دل سے مقابل جگہ جگہ

غربت میں سنگِ راہ کچھ آسانیاں بھی تھیں
کھاتی ہے ٹھوکریں مری مشکل جگہ جگہ

کیا پوچھتا ہے وعدہ شکن کیا ہیں داغِ دل
اُبھرے ہیں نقشِ وعدۂ باطل جگہ جگہ

اک سرگزشتِ درد ہے ہر ذرّہ خاک کا
پہنچی ہے داستانِ غمِ دل جگہ جگہ

اب یادگارِ فانیِ بسمل ہے اس قدر
گلگوں ہے خاکِ کوچۂ قاتل جگہ جگہ

# ردیف ی

نہیں کہ وحشتِ دل چارہ گر نہیں ہے مجھے
جنوں چارۂ وحشت مگر نہیں ہے مجھے

خرابِ لذتِ جانکاہیِ محبت ہوں
مآلِ عشق سے قطعِ نظر نہیں ہے مجھے

نہیں یہ مردنِ دشوار بے سبب یعنی
یقین مژدۂ پیغامبر نہیں ہے مجھے

جنوں بھی اثرِ بےخودیِ غم نہ سہی
نہیں خبر ہے کہ اپنی خبر نہیں ہے مجھے

نہ بارِ منتِ ناخن نہ خطرۂ سوزن
مجالِ بخیۂ زخمِ جگر نہیں ہے مجھے

یہ کیا ہے پھر کہ مجھے اک جہاں نظر آیا
خمارِ بادۂ وحدت اگر نہیں ہے مجھے

یہ جستجو ہے کہ ہے عالمِ مجاز کہاں
تلاشِ چشمِ حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

ہلاکِ تلخیِ تاثیرِ شکوہ ہوں فانیؔ
شکایتِ گلۂ بے اثر نہیں ہے مجھے

مشتاق خبردار رہیں دل سے جگر سے
ملتی ہے زمانے کی نظر اُن کی نظر سے

مُنہ ڈھانپ لیا جوشِ ندامت کے اثر سے
خورشیدِ قیامت نکلے ہے دامنِ تر سے

یہ سایہ بھی اُٹھا مرے امید کے سر سے — مُنہ موڑ لیا آہ نے دُنیائے اثر سے

دل جن سے ملے اب وہ لگاہیں نہیں ملیتں — ملنے کو تو ملتی ہے نظر ان کی نظر سے

پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں رفو کے بھی ہیں ٹانکے — سینہ ہیں دہواں خیر سے اُٹھتا ہے کدہر سے

اُمید اثر اور ان آہوں کو جو نکلیں — اللہ کا گھر پھونک کے اللہ کے گھر سے

کیا پھر تیرے ناوک نے کیا عزم نوازش — لبیک کی آتی ہے صدا چاک جگر سے

عرفانِ محبت سے جدا دل نہیں ہوتا — لیتے ہیں یہاں فال خبر ذوق خبر سے

بیکاری وحشت میں ہم اے گریہ وحشت — دیوار کی صورت کو ملا لیتے ہیں در سے

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ غافلؔ
روتی ہے گلے مل کے سحر شمع سحر سے

عیش جہان باعث نشاط نہیں ہے — خندۂ تصویر انبساط نہیں ہے

گریہ کے آداب کے حواس ہیں کس کو — ہائے کہ اب تاب احتیاط نہیں ہے

روح کو کیوں تن سے اختلاط ہے باقی — دہر میں اب رسم اختلاط نہیں ہے

طاقتِ دل دیکھی جواب پر اب تک — قوتِ غم رو بہ انحطاط نہیں ہے

انکی جفائیں بھی رنگ فنا نہیں یعنی
غیر سے بھی اب وہ ارتباط نہیں ہے

داغ باندازۂ جگر نہیں فانی
وسعت منزل بقدر بساط نہیں ہے

ہوش رہے نہ وحشی کا فکر مآل رہ نہ جائے
خلوت یاد یار میں کوئی خیال رہ نہ جائے

عشق ہے جب جنوں تو پھر شاد ہو اے دل حزیں
کوئی گلہ اٹھا نہ رکھ کوئی سوال رہ نہ جائے

وعدۂ فریب اور تند ہوائے ہوائے شوق
ہاں رہِ انتظار میں گردِ ملال رہ نہ جائے

تابِ نظارۂ جلال حشر میں بخش کر مجھے
شانِ جمال بھی دکھا شائقِ جمال رہ نہ جائے

عجز ادھر ادھر غرور دونوں غیور ہے غیور
دامنِ مدعا سے دور دستِ سوال رہ نہ جائے

اب جو ہوا ہوا مآل چھوڑ خدا پہ اندمال
زخمِ جگر پہ خاک ڈال تیر سنبھال رہ نہ جائے

جبر قبولِ علم کر کارِ رضا تمام کر
غیرتِ غم کو رام کر اُف کی مجال رہ نہ جائے

نزع میں واہ آہ دے اب نہ حیا کو راہ دے
عہدِ کرم نباہ دے پرسشِ حال رہ نہ جائے

فانیؔ زار جانبری عشق میں مصلحت نہیں
جان ہو داغِ دل کے بعد مجھ کے وبال رہ نہ جائے

رہ جائے یا بلا سے یہ جان رہ نہ جائے
تیرا تو اے ستمگر ارمان رہ نہ جائے

جو دل کی حسرتیں ہیں سب نکل ہی جائیں تو بہتر
اس گھر سے کوئی باہر مہمان رہ نہ جائے

اے سوزِ غم جلا دے اے دردِ خوں رلا دے
کچھ بھی دل لگی کا سامان رہ نہ جائے

سب نذر ہی ہوئیں ہے محشر اور اب دل
یہ ایک رہ گیا ہے ویران رہ نہ جائے

وہ جام کفر پرور بھر دے کہ مست کر دے
مستوں کے دل میں باقی ایمان رہ نہ جائے

آ کر پلٹ نہ خالی اے مرگ جان لے جا
فانی کے سر پہ تیرا احسان رہ نہ جائے

ہر تصور جلوۂ صورت کا کفر انگیز ہے
خاکِ دل اللہ اکبر کبریا ہی کا فرخیز ہے

بھر کے ساقی ایک جام مے زہر آلود لا
یعنی غم کم ہو، وہیں آج آتشِ دل تیز ہے

ہوش کا سرمایہ وحشت کے سوا ممکن نہیں
عالم اک مجموعۂ ذراتِ صحرا بیز ہے

تھی شکستِ دل مگر آ جا آوازِ شکست
ٹوٹ کر بھی دل طلسمِ شوقِ یاس آمیز ہے

ہے فنا آبادِ غم اک معنیِ لفظ آفریں
صورت آبادِ جہاں اک لفظِ معنی خیز ہے

شاید آ پہونچی ہے غم کی آخری منزل قریب
رشتۂ ہستی کو جواب سانس اک مہمیز ہے

جلوہ کیا دیکھے کوئی قدرت نہیں فرصت کہاں
یاں نقابِ جلوہ خود حسنِ تماشا ریز ہے

گو نہیں جز ترکِ حسرت زندگی کا علاج
آہ وہ بیمار جو آزردۂ پرہیز ہے

ہائے اور اک ہستی ہوں متکلف طرف
زندگی میری دروغِ مصلحت آمیز ہے

مرگِ فانی کو ہے یارب آہ اب کیا انتظار
دیر سے پیمانۂ عمرِ وفا لبریز ہے

گردش وہی یہاں بھی سپہر کہن میں تھی
غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی

آزردہ کیوں ہوئے مری آشفتگی سے تم
آخر یہی تو زلف شکن در شکن میں تھی

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے
میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

بے پردہ ذکر یار ہے در پردہ یاد یار
میری زباں پہ ہے جو دلِ برہمن میں تھی

بعد فنا بھی کم نہ ہوئیں بے قراریاں
لاشہ نہ تھا مرا کوئی بجلی کفن میں تھی

وہ گل ہے گل جسے خلوت میں بار تھا
وہ شمع شمع ہے جو تری انجمن میں تھی

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں

کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی
بدلا ہُوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر
کچھ خاک سی اُڑی ہوئی سارے چمن میں تھی
اے یاس تو نے آکے اُسے بھی مٹا دیا
لذت سی کچھ جو شکوۂ رنج و محن میں تھی
لو آج مرگِ فانیؔ بیکس سے مٹ گئی
وہ اک خلش جو خاطرِ اہلِ وطن میں تھی

ہم اپنے جی سے گذرے تو سحر کی
شبِ غم بڑھ چلی تھی مختصر کی
تمہیں کس دل سے اپنی جان کہیئے
وفا اس نے تو کی اور عمر بھر کی
انہیں بے چین کرنا چاہتا ہے
قضا آئی ہے کیا درد جگر کی
کشش کیسی کہاں کا جذبۂ دل
وہ آئے ہیں بن آئی ہے اثر کی
ہم اکثر جا کے ویرانے سے پلٹے
ہمارے گھر سے ویرانی نہ سرکی
مرا قتل ان کے ہاتھوں یہ تو بانیں
کچھ ان کے مُنھ کی ہیں کچھ نامہ بر کی

تمہارے عشق کا اللہ رے فیض — جگر میں دُھوم ہے دردِ جگر کی
نگاہِ شوق کے دم بھر تھیں انکھیں — اب آنکھیں یادگاریں ہیں نظر کی
اٹھا ہاتھ اے تصورِ فاتحہ کو — یہ دل کی ہے وہ تربت ہے جگر کی

شبِ فرقت کٹی یا عُمرِ فانی
اجل کے ساتھ آمد ہے سحر کی

کم ہے یا بڑھ گئی وحشت تیرے دیوانوں کی
دامنوں کی ہے خبر اب نہ گریبانوں کی
فصلِ گُل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی
دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی
دل کے تیور تو بجھے یاس کے چھینٹوں سے مگر
نہ بجھی آگ لگائی ہوئی ارمانوں کی
حُسن مجبورِ تغافل ہے ادب شرطِ وفا
رہ گئی شرم غمِ عشق کے انسانوں کی

چشم ساقی کی وہ مخمور نگاہی توبہ
آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوے پیمانوں کی

طوق منت کے بڑھا ہو گئی منت پوری
بیڑیاں موت نے کاٹیں ترے دیوانوں میں

اب جفا ہے نہ وفا یادِ وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانوں کی

دل میں رگ رگ سے کھنچ آئی ہیں لہو کی بوندیں
دعوتیں سینۂ فانی میں ہیں پیکانوں کی

مانا حجابِ دید مری بے خودی ہوئی — تم وجہ بیخودی نہیں یہ ایک ہی ہوئی
دل ہے وہ طاق غمکدۂ عمرِ روش کا — رکھی ہے جس میں شمعِ تمنا بجھی ہوئی
میں منزلِ فنا کا نشانِ شکستہ ہوں — تصویرِ گردِ بادِ وفا ہوں مٹی ہوئی
تعمیرِ دل نے تجھ سے لیا انتقام عشق — تیری ہی بزم جلوہ گہ عاشقی ہوئی
آتی رہیگی خیر اب اس زندگی کو موت — یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

...م کس ادا کی تماشائیوں میں تھا — پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی
...ے دل میں یاس کی اللہ رے اوگیر — جو آرزو کہ خلق ہوئی کشتنی ہوئی
...ے دعا کہ اُف تو کرے دردمند عشق — آؤ تو دل کی چوٹ پھر آئی دُکھی ہوئی
...وجود کفر مری زندگی گناہ — ہستی کو ہوش ہوش کو لازم خودی ہوئی
...ب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں — آواز آرہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی
...ہے اختیاط ندامت نہیں ضرور — لے اب چھری تو پھینک لہو سے بھری ہوئی

فانی وہ میں ہوں نقطۂ موہوم اتصال
جس میں عدم کی دونوں حدیں ہیں ملی ہوئی

...ٹا دیا ہے رنگ چمن لالہ زار نے — شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے
...ام شامِ گور ہے ہر صبح صبحِ حشر — کیا دن دکھائے گردشِ لیل و نہار نے
...کے پھول شام سے مرجھا کے رہ گئے — رو رو کے صبح کی مری شمع مزار نے
...ا ہم نہ تھے فریب تمنا سے بے خبر — کیا کہیے کیا کیا دل امیدوار نے

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گزار دی
اک مرگ ناگہاں کے غم انتظار نے

بشر میں عکسِ موجودات عالم ہم نے دیکھا ہے
وہ دریا ہے یہ قطرہ لیکن اس قطرہ میں دریا ہے

مری میت پہ اُن کا طرزِ تم کس بلا کا ہے
دلِ بے مدعا سے پوچھتے ہیں مُدعا کیا ہے

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارہ ہے بہہ جائے تو دریا ہے

کوئی دل میں نہیں آیا تو پھر یہ داغِ دل کیا ہے
بتا اے عشق یہ کس چور کا نقشِ کفِ پا ہے

میری محرومیوں کا فیض جاری ہے رگ و پے میں
بت میں جو لہو کی بوند ہے خونِ تمنا ہے

غبارِ رشکِ خارستانِ حسرتِ یاس کے منظر
ہمارے دل کی دُنیا بھی کوئی دُنیا میں دُنیا ہے

تمہارے ظلم، طعنے غیر کے لوگوں کے آوازے

محبت میں دل مجبور کو سب کچھ گوارا ہے
نظر آتے ہیں دل میں آج پھر آثارِ بے تابی
ہم اے اُمید سمجھے اس میں کچھ تیرا اشارا ہے
محبت ہی نہیں تو پاسِ آدابِ محبت کیا
وفا کی یا جفا کی جانے دو یہ ذکر ہی کیا ہے
اُسی کو تم مگر اے دُنیا جان کہتے ہو
وہ کانٹا جو مری رگ رگ میں رہ رہ کر کھٹکتا ہے
زبانِ خنجرِ ظالم لاکھ بے تاثیر ہوں نالے
خبر دل کی نہ ہو دل کو کہیں ایسا بھی ہوتا ہے
شبِ فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں
جگر تو خیریت سے ہے مزاجِ دل تو اچھا ہے
یہ کیا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اُس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہے

کیا ہوا باندھی ہے صدقے نالۂ شبگیر کے
آسماں پر اُکھڑے جاتے ہیں قدم تاثیر کے

بے مروت بن کے اب کیا سوئے صحرا جائیے
لوٹتے ہیں پانوں پر حلقے مری زنجیر کے

ضبط باقی غم سلامت ہے تو سُن لینا کبھی
آہ گھبرا کر نکل آئی کلیجہ چیر کے

وصل سے محروم میں ہوں ورنہ گستاخی معاف
بوسے لیتا ہے تصور آپ کی تصویر کے

مجھ کو مضطر دیکھ کر کہتا ہے "قاتل پیار سے
آ ادھر سایہ میں سو جا دامن شمشیر کے

ساتھ جائے گا مری میت کے سامان خلش
دل میں رکھ چھوڑے ہیں پیکاں میں نے تیرے تیر کے

میرے مرتے ہی دلِ بیتاب کو چین آگیا

زندگی صدقے ہیں اُتری گردشِ تقدیر کے

سعیِ درماں بے اثر فکرِ دوا بے فائدہ
زخمِ دل اے چارہ گر قائل نہیں تدبیر کے

یاس کے آتے ہی ارماں دل سے یہ کہکر چلے
ہم نہیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے

دیکھئے کیا ہو وہ اور آزردگیِ بے سبب
ہم خطا ناکردہ خوگر عذرِ بے تقصیر کے

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

تاکیدہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی
مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

آئے ہی تیرے وعدۂ فردا کا اعتبار
گھبرا کے مر نہ جائے تو پھر کیا کرے کوئی

وہ جلوہ بے حجاب سہی ضد کا کیا علاج
جب دل ہی سر کے آنکھ سے پردہ کرے کوئی

کہتے ہیں حسن ہی کی امانت ہے دردِ عشق
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

خالی ہے بزم ذوقِ طلب اہلِ ہوش سے
اتنا نہیں کہ تیری تمنا کرے کوئی

وہ درد دے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو
اُس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

فانی دعائے مرگ کی تکرار کیا ضرور
غافل نہیں کہ اُن سے تقاضا کرے کوئی

ابتدائے عشق ہے لطفِ شباب آنے کو ہے
صبر رخصت ہو رہا ہے اضطراب آنے کو ہے
قبر پر کس شان سے وہ بے نقاب آنے کو ہے
آفتابِ صبح محشر ہمرکاب آنے کو ہے
مجھ تک اس محفل میں پھر جامِ شراب آنے کو ہے
عمر رفتہ پلٹی آتی ہے شباب آنے کو ہے
ہائے کیسی کشمکش ہے یاس بھی ہے آس بھی
دم نکل جانے کو ہے خط کا جواب آنے کو ہے
ناامیدی موت سے کہتی ہے اپنا کام کر

آس کہتی ہے ٹھہر خط کا جواب آنے کو ہے
بھر کے ساقی جامِ مے اک اور لا اور جلد لا

ان نشیلی انکھڑیوں میں پھر حجاب آنے کو ہے
خانۂ تصویر میں آنے کو ہے تصویرِ یار

آئینہ میں قدِ آدم آفتاب آنے کو ہے
اب کے سوئے کیا اٹھیں گے فتنۂ محشر سے ہم

صبحِ محشر کے قریب آنکھوں میں خواب آنے کو ہے
دیکھیے موت آئے فانی یا کوئی فتنہ اُٹھے

میرے قابو میں دلِ بے صبر و تاب آنے کو ہے

ہستی دو روزہ گویا کہ نہیں فانی — اللہ رے ترا اے دل اندازِ پریشانی
تعبیر اجل نے دی اس خوابِ پریشاں کی — ہم مر کے تجھے سمجھے اے ہستیِ انسانی
کیونکر میں کہوں تم نے آئینہ نہیں دیکھا — بے وجہ نہیں ہرگز آئینہ کو حیرانی
سن میری خموشی سے افسانۂ غم میرا — دزدیدہ نگاہی سے کر پرسشِ پنہانی

کیا ہم شبِ وصل ان سے فرقت کا گلہ کرتے
تھی رات بہت تھوڑی اور بات تھی طول آئی

ہاں میرے قدم سے ہے ویرانے کی آبادی
واں گھر میں خدا رکھے آباد ہے ویرانی

پھر خواب میں طوق آیا زنجیر نظر آئی
در پردہ ہے وحشت کی پھر سلسلہ جنبانی

مانا کہ غمِ جاناں غارت گرِ ساماں ہے
رکھا ہی یہاں کیا ہے جز بے سر و سامانی

مشکل مرے مرنے کی مشکل ہے کہ آساں ہو
کچھ ناز کی قاتل کچھ اپنی گراں جانی

فانیؔ وہ بلا کش ہوں غم بھی مجھے راحت ہے
میں نے غمِ راحت کی صورت بھی نہ پہچانی

متاعِ جلوہ تحیر ہے مجھ کو سکتا ہے
دلِ آئینہ ہے کہ منہ آئینہ کا تکتا ہے

حجابِ زعمِ تماشا اٹھا تو کچھ دیکھوں
رہی نگاہ یہ پردہ تو اٹھ بھی سکتا ہے

وہ دل میں ہوک سی اٹھی وہ مجھ کو ہوش آیا
وہ درد کی دوا تو ہے پھر چمکتا ہے

امید و بیم پہ ہے ہستی بشر موقوف
کہ جا کے دم پلٹ آتا ہے دل ٹھہرتا ہے

خفا ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان ہے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

اجل بس ایک ہی کانٹا نکال کر جلدی
ٹھہر کہ خارِ تمنا ابھی کھٹکتا ہے

حدودِ غم سے غمِ عشق بڑھ چلا فانیؔ
وہ جامِ غم کہ لبریز تھا چھلکتا ہے

عشق نے دل میں جگہ کی تو قضا بھی آئی
دردِ دُنیا میں جب آیا تو دوا بھی آئی

دل کی ہستی سے کیا عشق نے آگاہ مجھے
دل جب آیا تو دھڑکنے کی صدا بھی آئی

صدقے اُتریں گے اسیرانِ قفس چھوٹے ہیں
بجلیاں لے کے نشیمن پہ گھٹا بھی آئی

ہاں نہ تھا باپ اثرِ بندِ مگر کیا کہیے
آہ پہونچی تھی کہ دشمن کی دُعا بھی آئی

آپ سوچا ہی کئے اُس سے ملوں یا نہ ملوں
موت مشتاق کو سٹی میں ملا بھی آئی

تو مسیحا نے بھی اللہ نے بھی یاد کیا

آج بیمار کو ہچکی بھی قضا بھی آئی

دیکھ یہ جادۂ ہستی ہے سنبھل کر فانیؔ

پیچھے پیچھے وہ دبے پاؤں قضا بھی آئی

مر کر مریضِ غم کی وہ حالت نہیں رہی — یعنی وہ اضطراب کی صورت نہیں رہی

ہر لمحہ حیات رہا وقفِ کارِ شوق — مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی

اک نالۂ خموش مسلسل ہے اور ہم — یادش بخیر ضبط کی طاقت نہیں رہی

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانہ کا ذکر کیا — اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

وہ عہدِ دلفریبئ تاثیر اب کہاں — مدت سے آہ آہ کی حسرت نہیں رہی

اُنکے تو دل سے نقشِ کدورت بھی مٹ گیا — ہم شاد ہیں کہ دل میں کدورت نہیں رہی

دل اور ہوائے سلسلہ جنبائی نشاط — کیوں پاسِ وضعِ غم تجھے غیرت نہیں رہی

اے دردِ عشق اب تو خدا کے لئے نہ چھیڑ — دل میں کراہنے کی بھی طاقت نہیں رہی

ہر بیگنہ سے وعدۂ بخشش ہے روزِ حشر — گویا گناہ کی بھی ضرورت نہیں رہی

اے عرضِ شوق مژدہ کہ دل چاک ہو گیا — تکلیفِ پردہ داریِ حسرت نہیں رہی

پتھرا گئی تھی آنکھ مگر بند تو نہ تھی
اب یہ بھی انتظار کی صورت نہیں رہی

عبرت نے بیکسی کا نشاں بھی مٹا دیا
اُڑتی تھی جس پہ خاک وہ تربت نہیں رہی

محشر میں بھی وہ عہدِ وفا سے مکر گئے
جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

کس منہ سے غم کے ضبط کا دعویٰ کرے کوئی
طاقت بقدرِ حسرتِ راحت نہیں رہی

**فانی** امیدِ مرگ نے بھی دیدیا جواب
جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی

اب لب پہ وہ ہنگامۂ فریاد نہیں ہے
اللہ رے تری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے

آتی ہے صبا سوئے لحد اُنکی گلی سے
شاید مری مٹی ابھی برباد نہیں ہے

اللہ بچائے اثرِ ضبط سے ان کو
بیداد تو ہے شکوۂ بیداد نہیں ہے

آمادۂ فریاد رسی ہے وہ ستمگر
فریاد کہ اب طاقتِ فریاد نہیں ہے

دنیا میں دیارِ دلِ فانی کے سوا ہائے
کوئی بھی وہ بستی ہے جو آباد نہیں ہے

مانا کہ بات وعدۂ فردا پہ ٹل گئی
اور بیوفا جو کل بھی نہ یہ آج کل گئی

اس خانۂ خراب کی بربادیاں نہ پوچھ
یادش بخیر آہ بھی دل سے نکل گئی

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی

کچھ کہہ کے چارہ ساز نے تسکین دی تو ہے
سُنتا تو ہوں کہ آپ ہی حالت سنبھل گئی

آتی ہے خاکِ جادۂ ہستی سے بوئے دل
کس آرزو بھرے کی تمنا کچل گئی

دل کیوں شبِ فراق تڑپ کر ٹھہر گیا
کیوں اضطراب کیا تری صورت بدل گئی

تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق
جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

اللہ رے نوکِ نشترِ غم کی لگاوٹیں
اک اک لہو کی بوند پہ ظالم مچل گئی

فانی کے دل سے آیۂ لاتقنطو کے بعد
زاہد وہ دل فریبیٔ حسنِ عمل گئی

امیدِ التفات کو رسوا نہ کیجئے
لازم نہیں کہ خونِ تمنا نہ کیجئے

شرمندہ وہم رشک سے اتنا نہ کیجئے
آئینہ دیکھ کر مجھے دیکھا نہ کیجئے

اندیشۂ عیشِ خوابِ لحد کا نہ کیجئے
ہنگامِ نزع وعدۂ فردا نہ کیجئے

دیکھو جو وقتِ پرسشِ جاناں بھول جائیں
ٹھانی تو ہے کہ غرضِ تمنا نہ کیجئے

سرکار پاسِ وضعِ جفا چاہتا ہوں میں — یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھا نہ کیجیے

کیا فرض تھی نگاہِ مکرر ازل کے بعد — یہ جان ہے یہ دل ہے تقاضا نہ کیجیے

فانی بلائے مرگ سے غم کیجیے غلط

اب جستجوئے راحتِ دنیا نہ کیجیے

کارواں گزرا کیا ہم رہگزر دیکھا کیے — ہر قدم پر نقشِ پائے راہبر دیکھا کیے

ترکِ بیداد آہ اک تمہید تھی بیداد کی — دل جلا کر پھر نالوں کا اثر دیکھا کیے

دردمندانِ وفا کی ہائے رے مجبوریاں — دردِ دل دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کیے

یاس جب چھائی امیدیں ہاتھ مل کر رہ گئیں — دل کی نبضیں چھٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کیے

رُخ مری جانب نگاہِ لطف دشمن کی طرف — یوں اُدھر دیکھا کیے گویا اِدھر دیکھا کیے

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد — مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کیے

زیست تھی فانی بقدرِ فرصتِ تمہیدِ شوق

عمر بھر ہم یہ تو نورِ لبشر دیکھا کیے

ذرہ ذرہ تربتِ فانی کا شیون جوش ہے۔

اِس صفِ ماتم میں اک شمعِ لحد خاموش ہے
پھیر لے میت کی جانب سے نگاہِ التفات
سینکڑوں شکووں کے نرغے میں لبِ خاموش ہے
وصل ہو یا ہجر دونوں ہیں مرے مشرب میں کفر
شوقِ وحدت آشنا بیگانۂ آغوش ہے
طور تو ہے ربِّ ارنی کہنے والا چاہیئے
لن ترانی ہے مگر نا آشنائے گوش ہے
اک طلسمِ فیض ہے سینہ سوز دل کی ذات
بے تکلف ہر نفس اک شعلۂ خس پوش ہے
راز آزادی فقط تیرے اسیروں پر کھُلا
جو ترے قدموں پہ سر ہے بے نیازِ دوش ہے
زندگی خود کیا ہے فانیؔ یہ تو کیا کہیئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

مجھے قسم ہے تمہے صبر آزمانے کی — کہ دل کو اب نہیں برداشت غم اُٹھانے کی

ترا اسیر ہوں چاہے تو ذبح کر صیاد — نہ توڑ دل کہ امانت ہے آشیانے کی

خیالِ یار ہے اک حسن و عشق کی دُنیا — مری نگاہ میں ہیں گردشیں زمانے کی

زبانِ حال ٹھہر داستانِ عشق نہ چھیڑ — کہ خوابِ مرگ ہے تاثیر اس فسانے کی

گلہ ضرور نہیں حالِ بے خودی معلوم — تمہاری یاد کو عادت ہے بھول جانے کی

نہ دل کے ظرف کو دیکھو نہ طور کو دیکھو — بلا کی دُھن ہے تمہیں بجلیاں گرانے کی

نہ سانس کا ہے بھروسا نہ آہ میں تاثیر — وہ کیا پھرے کہ ہوا پھر گئی زمانے کی

نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے — ارادہ یار نے ٹھہرا کے روٹھ جانے کی

جبیں ہے دیر سے بیتابِ سجدہ اے فانی
کدھر ہے خاک ترے دل کے آستانے کی

ادا سے آڑ میں خنجر کی مُنہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے
الٰہی کیوں نہیں ہوتی کوئی بلا نازل ،

اثر ہے دیر سے دستِ دُعا اٹھائے ہوئے
تری لگائی ہوئی آگ حشر تک نہ بجھی
ہوئے نہ مر کے بھی ٹھنڈے ترے جلائے ہوئے
بلائے جاں ہے مگر پھر بھی آرزو ہے تری،
ہم اس کو اپنے کلیجے سے ہیں لگائے ہوئے
سحر ہوئی کہ وہ یادش بخیر آتا ہے
چراغ ہیں مری تربت کے جھلملائے ہوئے
تمہیں کہو تمہیں اپنا سمجھ کے کیا پایا
مگر یہی کہ جو اپنے تھے سب پرائے ہوئے
کسی کا ہائے وہ مقتل میں اس طرح آنا
نظر بچائے ہوئے آستیں چڑھائے ہوئے
اجل کو مژدہ فرصت کہ آج فانیِ زار
اُمیدِ وصل سے بیٹھا ہے لو لگائے ہوئے

رابطہ جسم و جاں دیکھئے کب تک رہے
زیست کا ہم پر گماں دیکھئے کب تک رہے

یہ گراں جانیاں مجھ سے جدا ہوں تو ہوں
سعیٔ الم رائیگاں دیکھئے کب تک رہے

دیکھئے کب تک مٹے سینۂ فانیؔ کا داغ
تربتِ دل کا نشاں دیکھئے کب تک رہے

غم مجسم نظر آیا تو ہم انساں سمجھے
برق جب جسم سے وابستہ ہوئی جاں سمجھے

شوق کی گرمیٔ ہنگامہ کو وحشت جانا
جمع جب خاطرِ وحشت ہوئی ارماں سمجھے

حکمِ وحشت ہے کہ زنداں کو بھی صحرا جانو
دل وہ آزاد کہ صحرا کو بھی زنداں سمجھے

فانیؔ اس عالم ظاہر میں سراپا غم تھا
چھپ گیا خاک میں تو ہم غمِ پنہاں سمجھے

نصیب ہو بھی تو کیا لطف وصلِ یار میں ہے
سوائے عیش سو تقدیرِ انتظار میں ہے

فلک نے یوں تو جو چاہا کیا ستم تو یہ ہے
شمارِ دل بھی ستم ہائے بے شمار میں ہے

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبورِ خاموشی کا ہائے
وہ جنازے پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے

تو میرے دل کی نہ سُن یہ آئینہ ہے اس سے پوچھ
تیری صورت آشنا دردِ آشنا کیوں ہو گئے

کیا تمہیں اندازۂ ضبطِ محبت ہو گیا
چشمِ بد دور اب ستم حد سے سوا کیوں ہو گئے

دل کی صورت آ کے پہلو سے تمہیں جانا نہ تھا
اور گئے بھی تھے تو جانِ بے وفا کیوں ہو گئے

کیا سُنانا چاہتا ہے اے فریبِ التفات
خیر ہے لب آج مطلب آشنا کیوں ہو گئے

اور فانیؔ بڑھ گئی بیتابیٔ دل بعدِ مرگ
کیا کہیں مر کر گرفتارِ بلا کیوں ہو گئے

محشر میں عذرِ قتل بھی ہے خونبہا بھی ہے

وہ اک نگاہ جس میں گلہ بھی حیا بھی ہے

اس درد کا علاج اجل کے سوا بھی ہے

کیوں چارہ ساز تجھ کو امیدِ شفا بھی ہے

جب عشق ابتداء ہی نہیں انتہا بھی ہے

دل میری زندگی ہی نہیں ہے قضا بھی ہے

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ

اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

ے حدِ ضبطِ درد نہ کر دل سے اب دریغ

اِک آہِ بے صدا کہ دُعا بھی دوا بھی ہے

سامانِ صد نگاہ ہے ہر ذرّہ خاک کا

لیکن یہ دیکھنا ہے کوئی دیکھتا بھی ہے

ں دل میں درد بھی ہے زباں بھی نہیں ہے بند

کس سے کہیں کوئی دلِ درد آشنا بھی ہے

دل اور حکمِ ضبط سے یارائے انحراف

پردے میں کوئی دشمنِ اہلِ وفا بھی ہے

فانی سے دل کے ساتھ تقاضا ہے جان کا

ظالم اس ابتدا کی کوئی انتہا بھی ہے

غم مٹا دیا، غم کا لذت آشنا کر کے
کیا کیا ستمگر نے خوگرِ جفا کر کے

کہتے ہو وفا کی بھی ایک حد معین تھی
کس قدر پشیماں ہوں ترکِ مدعا کر کے

وہ مری شکایت پر چپ کھڑے ہیں ششدر ہیں
بت انہیں بنایا یا اب خدا خدا کر کے

وہ مرے جنازے پر بعد مرگ آئے ہیں
مدعا ہوا حاصل ترکِ مدعا کر کے

لذتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی

دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے

جاتا ہے صبر بے سروساماں کئے ہوئے

ناموسِ عشق ہدیہ مژگاں کئے ہوئے

افشائے رازِ اہلِ جنوں مصلحت نہیں

پھرتا ہوں دھجیوں کو گریباں کئے ہوئے

پھر لے چلا ہے گریۂ بے تاب خطِ شوق

دل کے لہو کو زینتِ عنواں کئے ہوئے

پھر ناوکِ نگاہ کا رُخ پھیر سوئے دل

ساماں صد جراحتِ پنہاں کئے ہوئے

دل کی لحد پہ خاک اُڑانے چلا ہے عشق

ذرّہ سے اکتسابِ بیاباں کئے ہوئے

پھر گوشہ گیر حلقۂ زنجیر ہے جنوں

صحرا کو نذرِ تنگیٔ زنداں کئے ہوئے

ادراک درد دل بھی رہا ہر نفس کیساتھ

دشواریٔ حیات کو آساں کئے ہوئے

طوفانِ اضطراب جنوں اُٹھ کے دیر سے

بیٹھا ہوں جمع خاطرِ داماں کئے ہوئے

اے عقلِ غم فروشِ فراغت نما ٹھہر

آتا ہے عشق درد کو درماں کئے ہوئے

کیوں اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل

لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

فانیؔ اب اُن کی یاد پہ کیا کیجیے نثار

مدت ہوئی وداعِ دل و جاں کئے ہوئے

شکوہ کیا کیجے نگارہ یار خود غم دیدہ ہے

کیا تماشا ہے کہ دل کا چور بھی دزدیدہ ہے

اس کی ہستی سے جُدا میرا وجود اللہ رے وہم

بُلبُلا ہے عینِ دریا پھر بھی دامن چیدہ ہے

مائلِ پرواز ہے مقتل میں خونِ گرمِ دل

آتشِ سیال تھا اب شعلۂ بالیدہ ہے

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اُسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کیا ہستی ہے

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے رازِ بلندی پستی ہے

جان سی شے بِک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہُوا

جب بھی دُنیا بستی تھی اب بھی دُنیا بستی ہے
آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے
دل کا اُجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے
فانیؔ جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

تو شمع آئینہ خانہ ہے آئینہ کیا ہے
تری خدائی کے قرباں ماسوا کیا ہے
اُٹھا بھی دے نگہ ماسوا نگر کا حجاب
یہ دیکھنے ہی کا پردہ ہے دیکھنا کیا ہے
کیا ہے خلق مجھے باوجودِ علمِ گناہ
یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

---

اُبھری ہوئی ہے چوٹ دلِ دردمند کی
رکھنا قدم تصورِ جاناں سنبھال کے
کہتے ہیں جن کو ظرفِ محبت میں داغِ دل
وہ نقش تو نہوں ترے پائے خیال کے

ہنگامۂ شباب ہے اے دل ذرا ٹھہر
جاتا ہے تو کہاں مجھے آفت میں ڈال کے

قربان ایک آمدِ غم پر ہزار دل
صدقے اس ابتدائے قیامت کمال کے

---

سمائیں آنکھ میں کیا شعبدے قیامت کے
مری نظر میں ہیں جلوے کسی کی قامت کے

یہاں بلائے شبِ غم وہاں بہارِ شباب
کسی کی رات کسی کے ہیں دن قیامت کے

ستارے ہوں تو ستارے نہوں تو برقِ بلا
چراغ ہیں تو یہ ہیں بیکسوں کی تربت کے

اُلٹ دیا غمِ عشقِ مجاز نے پردہ
حجاب حسن میں کچھ راز تھے حقیقت کے

اوڑھائے ہیں کچھ انداز موت نے فانی
عتابِ یار کے روزِ سیاہِ فرقت کے

دیا اک جان کے دشمن کو دل جان نذرِ دلبر کی
یہ ہے اپنی کہانی قصہ کوتہ زندگی بھر کی

الٰہی کیا خبر لاتا ہے قاصد وصلِ دلبر کی
بلائیں لے رہی ہیں میری تدبیریں مقدر کی

قضا آئی بلبیب آیا وہ آئے دیکھ کون آیا

کسی نے اے جنوں زنجیر کھڑکائی مرے در کی

وہ شامِ وصل دشمن زلف سلجھاتے ہیں رُک رُک کر

انہیں یاد آگئیں کیا گتھیاں میرے مقدر کی

اجل کی آرزو ہو دل میں فانی اور دُنیا ہو

خدا رکھے یہی رونق ہے اس اجڑے ہوئے گھر کی

ہر ستم کا یہ تقاضا ہے کہ ہو فریاد بھی — اب تو جینا ہی پڑیگا شاد بھی ناشاد بھی

گلشنِ تصویر میں تھے طائرِ تصویر ہم — کیا کہیں کیونکر رہے مجبور بھی آزاد بھی

خیر ہے کیا چاہتی ہے اے نسیمِ کوئے یار — اب تو ظالم میری مٹی ہو چکی برباد بھی

---

اجل جو آئے تو اپنا بھی کام ہو جائے — تمام عمر کا قصہ تمام ہو جائے

نگاہِ ناز کا صدقہ نیاز مند ہیں ہم — کبھی قبول ہمارا سلام ہو جائے

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار تیرے — یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

…ری خدائی میں ہوتی ہے ہجر کی شام  الٰہی اپنی سحر کی بھی شام ہو جائے

---

…بنس دل وسعت پھنسا کر کوئی دیوانہ بنے  زلف جاناں کے بنا ہے کبھی سودا نہ بنے

…ے تری شان کو بتخانہ تو کعبہ بنجائے  دل کو سکتی ہے ترا کعبہ سے بتخانہ بنے

…ب تک آجائے غمِ ہجر تو شکوہ ہو جائے  آپ سن لیں تو عجب کیا ہے کہ افسانہ بنے

---

…ی وفا یار سے ایک ایک جفا کے بدلے  ہے گن گن کے لئے خوفِ فنا کے بدلے

…ی سپردِ درِ بتخانہ اجل نے مری خاک  کس کو سونپا مجھے ظالم نے خدا کے بدلے

…لطف بیداد حیا غصہ تغافل شوخی  رنگ کیا کیا نہ تلون نے ادا کے بدلے

…تیرے تیغ سے خنجر سے سناں سے مارا  کئی پہلو مرے قاتل نے قضا کے بدلے

…لفن لے کو بعد دیکھ نہ میلا ہو جائے  آج ہی کا ہم نے یہ کپڑے میں نہا کے بدلے

عشق اللہ بچائے وہ مرض ہے فانیؔ

زہر بیمار کو دیتے ہیں دوا کے بدلے

فانیؔ کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی
لے خوابِ محبت کی تعبیر نظر آئی

پھر ابر میں وحشت کی تصویر نظر آئی
لہرائی ہوئی بجلی زنجیر نظر آئی

جب میں نے دُعا ونکا رخ سوئے فلک دیکھا
تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی

جو دل سے نکل آئی وہ آہ سناں نکلی
جو ڈوب گئی دل میں وہ تیر نظر آئی

ہر عیش کی محفل میں پروانہ کا ماتم تھا
جو شمع نظر آئی دلگیر نظر آئی

کعبہ میں کلیسا میں ہم نے تو جہاں دیکھا
اے قصرِ وفا تیری تعمیر نظر آئی

جب خون ہوا دل کا وہ آنکھ نہیں آ بیٹھے
آہوں کا حجاب اُٹھا تاثیر نظر آئی

کایا غمِ دنیا کی وحشت نے پلٹ دی ہے
خاکِ رہِ ویرانہ اکسیر نظر آئی

دُنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دُھندلی سی مجھے دلکی تصویر نظر آئی

دل اُنکے نہ آنے تک لبریزِ شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

فانیؔ غمِ ہستی نے زندہ ہی مجھے سمجھا
جب تک مرے مرنے میں تاخیر نظر آئی

دل کی لگی نہیں تو خیر اب کوئی دل لگی سہی

فتنۂ شامِ غم کے بعد فتنۂ حشر ہی سہی
سازِ خیالِ یار سے چھیڑ چلی ہی کیوں نہ جائے
نغمۂ آرزو سنا نوحۂ یاس بھی سہی
شیوۂ عاشقی نہیں ہجر میں آرزوئے مرگ
ہاں نہیں زندگی عزیز موت ہی زندگی سہی

ہر چند کہ ہے لیکن ملتا ہے نشاں کوئی
پہلو میں تجھے ڈھونڈھے اے دردِ کہاں کوئی
یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اُس نے کہا کہیے
تو چپ ہیں کہ کیا کہیے کھلتی ہے زباں کوئی
برگشتہ مقدر کی تاثیر ارے توبہ
دل ہی پہ پڑ آئی کی آہ جہاں کوئی

شبابِ ہوش کی فی الجملہ یادگار ہوئی
جو عمر صرفِ تماشائے حُسنِ یار ہوئی

حسابِ حسرتِ جرمِ نظارہ دل سے پوچھ
نظر تو ایک جھلک کی گناہگار ہوئی

بساطِ عجز میں اک آہ تھی متاعِ حیات
سو وہ بھی صرفِ ستم ہائے روزگار ہوئی

بقدرِ ہستیٔ دل ہے خمارِ غم بدنام
خزاں خراب باندازۂ بہار ہوئی

نہیں کہ آہ میں تاثیر ہی نہیں لیکن
یہ دل نگار کبھی آسماں فگار ہوئی

کرم ہے رازِ امیدِ کرم کی ہستی کا
امید تیرے کرم کی اُمیدوار ہوئی

بلا سے ہجر میں جینے کی انتہا تو ہے
وہ ایک بار ہوئی یا ہزار بار ہوئی

ازل میں خلق ہوئی تھی جو بجلیوں کی روح
تری نگاہ مری جانِ بیقرار ہوئی

مے وجود کی حجت مے عدم کی دلیل
وہ اک نظر تھی جو شاید جگر کے پار ہوئی

بہار مذہبِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری
خزاں شہیدِ تبسم ہوئی بہار ہوئی

امیدِ مرگ پہ فانیؔ نثار کیا کیجئے
وہ زندگی کہ ہوئی بھی تو مستعار ہوئی

جب دل میں ترے غم نے حسرت کی بنا ڈالی

دُنیا مرے راحت کی قسمت نے مٹا ڈالی
ب برق نشیمن کو ہر شاخ سے کیا مطلب
جس شاخ کو تاکا تھا وہ شاخ جلا ڈالی
ظہار محبت کی حسرت کو خدا سمجھے
ہم نے یہ کہانی بھی سو بار سُنا ڈالی
ینے بھی نہیں دیتے مرنے بھی نہیں دیتے
کیا تم نے محبت کی ہر رسم اٹھا ڈالی
جینے میں نہ اب فالی مرنے میں شمار اپنا
ماتم کی بساط اُس نے کیا کہہ کے اٹھا ڈالی
ب اُنہیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دور دُلہن بن کے شباب آتا ہے
سر میں بھی مجھے امداد اجل تھی درکار
میری تربت پہ نہ آ تجھ سے حجاب آتا ہے

دید آخر ہے اُلٹ دیجئے چہرے سے نقاب
آج مشتاق کے چہرے پہ نقاب آتا ہے

کس طرف جوشِ کرم تیری نگاہیں اُٹھیں
کون محشر میں سزا وارِ عتاب آتا ہے

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم
کہ جنازہ پہ وہ غارت گرِ خواب آتا ہے

دل کو اس طرح ٹھہر جانے کی عادت تو نہ تھی
کیوں اجل کیا مرے نامے کا جواب آتا ہے

جلوہ رنگ ہے نیرنگ تقاضائے نگاہ
کوئی مجبور تماشائے سراب آتا ہے

ہو گیا خون ترے ہجر میں دل کا شاید
اب تصور بھی ترا نقش بر آب آتا ہے

ملتی جلتی ہے مری عمر دو روزہ فانیؔ
جی بھر آتا ہے اگر ذکر حباب آتا ہے

قطرہ دریائے آشنائی ہے — کیا تری شانِ کبریائی ہے
نیری مرضی جو دیکھ پائی ہے — خلشِ درد کی بن آئی ہے
وہم کو بھی ترا نشان نہ ملا — نارسائی سے نارسائی ہے
ون دل ہے جو دردمند نہیں — کیا ترے درد کی خدائی ہے
جلوۂ یار کا بھکاری ہوں — شش جہت کاسۂ گدائی ہے
موت آتی ہے تم نہ آؤ گے — تم نہ آئے تو موت آئی ہے
بچھ گئے راہ یار میں کانٹے — کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے
زک امید بس کی بات نہیں — ورنہ اُمید کب برآئی ہے
مژدۂ جنت وصال ہے موت — زندگی محشرِ جدائی ہے
رزو پھرے در پئے تدبیر — سعیٔ ناکام کی دہائی ہے

موت ہی ساتھ دے تو دے فانی
عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

یوں نہ نیرنگ جنوں پر کوئی قربان ہو جائے۔

گھر وہ صحرا کہ بہار آئے تو زنداں ہو جائے
برق دم لینے کو ٹھہرے تو رگِ جاں ہو جائے

فتنۂ حشر مجسم ہو تو انساں ہو جائے
جوہرِ آئینۂ دل ہے وہ تصویر ہے تو

دل وہ آئینہ کہ تو دیکھ کے حیراں ہو جائے
غم وہ راحت جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں

دم وہ مشکل ہے کہ موت آئے تو آساں ہو جائے
عشق وہ کفر کہ ایمان ہے دل والوں کا

عقل مجبور وہ کافر جو مسلماں ہو جائے
ذرّہ وہ رازِ بیاباں ہے جو افشا نہ ہوا

دشت و خشت ہے وہ ذرہ جو بیاباں ہو جائے
غم محسوس وہ باطل جسے کہتے ہیں مجاز

دل کی ہستی وہ حقیقت ہے جو عریاں ہو جائے

خلد بینا کو کہتے ہیں بقولِ واعظ
کعبہ بت خانہ کو کہتے ہیں جو ویراں ہو جائے

سجدہ کہتے ہیں درِ یار پہ مر جانے کو
قبلہ وہ سر ہے جو خاکِ رہِ جاناں ہو جائے

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے جس دن ظالم
زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

اے کاش شہادت کے ارمان نکل جاتے
قاتل کی نگاہوں کے تیوری بدل جاتے

آتے وہ تو فرقت کے دُکھ کیا ہیں اجل کیسی
آئی ہوئی ٹل جاتی آئے ہوئے ٹل جاتے

سر اب مجھے بھاری ہے صدقہ ترے خنجر کا
یہ بار اُتر جاتا جو وار ترے چل جاتے

---

جس قدر چاہے جلوے کو فراوانی دے

ہاں نظر دے تو مجھے فرصتِ حیرانی دے

ترجمانِ غمِ دل رنگ شکستہ ہے نہ آہ ،

کون اس عہد میں اب داد زباندانی دے

وحشتِ تازہ کا نوروز مبارک اے عشق

پھر بہار آئی مجھے خلعتِ عریانی دے

پھر تجھے زحمت درباں نہ مجھے شکوۂ غیر

میری قسمت کو جو توخدمتِ دربانی دے

خلشِ درد سے کم مایۂ غم ہیں محروم

جنس حرماں کو خدا عزتِ ارزانی دے

ہے ہوس ہوش تو اس ہوش سے میں باز آیا

کاش پھر بے خبری مژدۂ نادانی دے

اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یارب

در و دیوار دے اب انہیں ویرانی دے

سُن کے افسانۂ دل پھر بتبسم ہو جا

گریۂ شوق کو پھر دعوتِ طغیانی دے

رہ نہ جائے کہیں دشواریٔ فانی باقی

اس کی مشکل کو بھی اب خصتِ آسانی دے

وہ مشقِ خوئے تغافل پھر ایک بار رہے

بہت دنوں مرے ماتم میں سوگوار رہے

خدا کی مار جو اب دل پہ اختیار رہے

بہت فراق کے پردے میں بیقرار رہے

کسی نے وعدۂ صبر آزما کیا تو ہے

خدا کرے کہ مجھے تابِ انتظار رہے

فنا کے بعد یہ مجبوریاں ارے توبہ

کوئی مزار میں کوئی سرِ مزار رہے

سکونِ موت مری لاش کو نصیب نہیں
رہے مگر کوئی اتنا نہ بے قرار رہے

میں کب سے موت کے اس آسرے پہ جیتا ہوں
کہ زندگی مرے مرنے کی یادگار رہے

جو دل بچا نہ سکے جان کیا بچا لیں گے
نہ اختیار رہا ہے نہ اختیار رہے

میں غم نصیب وہ مجبورِ شوق ہوں فانیؔ
جو نامراد جیے اور امیدوار رہے

ہر چند کچھ اور ہے حقیقت — کہنے کو جو میں نہیں وہ تو ہے
کیا کیجئے سیرِ باغِ عالم — گل پردہ نشین رنگ و بو ہے
اللہ رے تری فسوں نوازی — جو دل ہے طلسم آرزو ہے

---

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے — میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

یا ترے محتاج ہیں اے خونِ دل
یا انہیں آنکھوں سے دریا بہہ گئے

موت اُن کا منہ ہی تکتی رہ گئی
جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے

تو سلامت ہے تو ہم اے دردِ دل
مر ہی جائیں گے جو جیتے رہ گئے

پھر کسی کی یاد نے تڑپا دیا
پھر کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے

اٹھ گئے دُنیا سے فانیؔ اہلِ ذوق
ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

اُس نورِ مجسّم کے افسانے کو کیا کہیئے
ہے شمع بھی پروانہ پروانہ کو کیا کہیئے

ہر در سے ترے طالب ناکام پلٹ آئے
کعبے میں ہے سنّاٹا بتخانے کو کیا کہیئے

کچھ کھیل نہ تھا یوں بھی پروانے کا جل بجھنا
جل کر نہ بجھے ایسے پروانے کو کیا کہیئے

آغاز بھی تو جس کا انجام بھی تو جس کا

اس دردِ محبت کے افسانے کو کیا کہیئے
آبادی کی آبادی ویرانے کا ویرانہ
ارمان بھرے دل کے کاشانے کو کیا کہیئے
اُجڑی ہوئی آنکھوں میں رونق تیرے دم سے تھی
ویران ہے ہر بستی ویرانے کو کیا کہیئے
کس نے اُسے دیکھا ہے اے حسرتِ نظارہ
فانی تو ہے دیوانہ دیوانے کو کیا کہیئے

رگ رگ میں اب اندازِ بسمل نظر آتا ہے
ہر سانس کے پردے میں قاتل نظر آتا ہے
وہ وعدۂ آساں پر مائل نظر آتا ہے
اب کارِ تمنا پھر مشکل نظر آتا ہے
تو دشنۂ دہلو میں حائل نظر آتا ہے
جیتے ہیں کہ مرجانا مشکل نظر آتا ہے

ترکِ غمِ ساحل کا حاصل نظر آتا ہے
لے ڈوبنے والے وہ ساحل نظر آتا ہے

دل کھوئے ہوئے برسوں گذرے ہیں مگر اب بھی
آنسو نکل آتے ہیں جب دل نظر آتا ہے

آغازِ محبت میں جینے ہی کے لالے تھے
اب خیر سے مرنا بھی مشکل نظر آتا ہے

تو مستِ خود آرائی ہم حسن کے متوالے
جو ہے تری محفل میں غافل نظر آتا ہے

روداد محبت کی تصویر ہے ہر آنسو
ہر قطرۂ خونیں میں اک دل نظر آتا ہے

بیتابیٔ دل بے صرفہ بے وجہ نہیں یعنی
دل دردِ محبت کے قابل نظر آتا ہے

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانیؔ
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

ہر دل ہے تیرے غم کی امانت لئے ہوئے
ذرّے ہیں اک جہانِ حقیقت لئے ہوئے

دے اذنِ عام عشق کو تاراجِ ہوش کا
بیٹھا ہوں دل میں صبر کی دولت لئے ہوئے

محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

اس خاکدانِ تیرہ میں کیا ڈھونڈتا ہوں میں
پھرتا ہوں شمعِ داغِ محبت لئے ہوئے

کافر ہوں گر یقیں نہ ہو کافر کی بات کا
وعدے ہیں اعتبارِ قیامت لئے ہوئے

روشن ہوئی وہ گورِ غریباں میں شمع طور
آغوشِ نور میں مری تربت لئے ہوئے

---

کترے ہیں یہ گل تیری اک جنبشِ دامن نے
یوں کرنہ لئے پیدا وہ پھول بھی گلشن نے
بخشا جو شرف ان کے اڑتے ہوئے دامن نے
اُٹھ اُٹھ کے بلائیں لیں خاکِ سرِ مدفن نے
جو مجھ پہ ہوئی ایسی بیداد نہ کی ہوگی
اللہ کے بندوں پر اللہ کے دشمن نے

وہ قصّہ موسیٰ پھر اے سوزِ جگر کہنا
کس آگ کی چنگاری دی وادیٔ ایمن نے

یہ سوختہ سامانی کس کس کے نہ کام آئی
لی ایک نہ اک بجلی ہر دانۂ خرمن نے

کل تک یہی گلشن تھا صیاد کبھی بجلی بھی
دُنیا ہی بدل دی ہے تعمیرِ نشیمن نے

یہ رشک و محبت کی روداد ہے اے فانیؔ
اک دوست کے پردے میں مارا غمِ دشمن نے

مشتاق نگاہوں کی اللہ رے رسوائی
میں محوِ تماشا ہوں دُنیا ہے تماشائی

تیری ہی نگاہوں کے سب دیکھنے والے تھے
تقدیر بگڑ بیٹھی تدبیر نہ کام آئی

بیداد کے اس تیور اس حُسن کے میں صدقے
اُن کو مرے رونے پر آئی تو ہنسی آئی

لبریز تموج تھا اک اک خطِ پیمانہ
محفل سے جو وہ اُٹھے لیتے ہوئے انگڑائی

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

# متفرق اشعار

کیا بلا کتنی ادائے پرسشِ یار
مجھ سے اظہار مدعا نہ ہُوا

وہ قیامت اٹھائے پھرتے ہیں
آسماں آج زیر پا نہ ہُوا

---

آہ تیوں پر دل کیا آیا ہاتھ ہی سے نادان گیا
خیر بلا سے دل ہی جاتا جان گئی ایمان گیا

---

ہے شان عبودیت معروف دعا ہونا
منظورِ مشیت تھا ہر نالہ رسا ہونا

بنیاد جہاں کیا ہے مجبور فنا ہونا
سرمایۂ ہستی ہے محرومِ بقا ہونا

---

ہر نفس آہ اور انفاس پہ جینے کا مدار
زندگی آہِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

---

آکے تماشا گاہ جہاں میں دادِ تماشا کیا چاہوں
یاں ہر ذرہ کہتا ہے میں ذرہ نہیں اک دنیا ہوں

محوِ تماشا ہوں میں یارب مدہوشِ تماشا ہوں
اُس نے کب کا پھیر لیا مُنہ اب کس کا مُنہ تکتا ہوں

---

شب گریۂ غم کے طوفاں کا وہ جوش اُسے توبہ
ہر اشک اُمڈ کر کہتا تھا میں دل کے لہو کا دریا ہوں

---

سازِ ہستی کو بس اے غم کے اشارے سے نہ چھیڑ
رہیں ٹوٹے ہوئے دل کی نہ ہو آواز کہیں

---

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

---

کہتے ہیں یہاں حضرتِ فانی تو نہیں ہیں
اس انجمنِ ناز میں کیا ہم بھی کہیں ہیں

---

گو ہستی تھی خوابِ پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی
چونک اُٹھے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

---

مجھے مرنے کی حسرت کارِ مشکل کی تمنا ہے
مرادم بھی کسی ناکام کے دل کی تمنا ہے

اجل سے ہے دلِ مایوس کو اُمیدِ آسائش
مری ڈوبی ہوئی کشتی کو ساحل کی تمنا ہے

---

دیکھ فانی وہ کوئی حشر اُٹھانا آیا
چونک اب خوابِ لحد سے کہ سحر ہوتی ہے

---

ہے جو اس کان ملاحت سے طلبگارِ نمک
زخمِ دل شاید تبسم آفریں ہونے کو ہے

اللہ اللہ سُرخیٔ رنگِ شفق کیوں اے جنوں
آسماں کیا کوئے قاتل کی زمیں ہونے کو ہے

---

مطلب ہے ضبطِ عشق سے تاثیرِ درد عشق
اخفائے حال سے غرض افشائے حال ہے

رودادِ مرگ و زیست ہے قصہ مختصر
مجبورِ زندگی کو بھی جینا محال ہے

---

روح کا آنسوؤں بھری آنکھوں میں پاترا ہے ہر کہ حیات مستعار نقش بروئے آب ہے
قاعدہ دان ضبط ہے شعلۂ غم کی داد دے برق کی وضع پر جابندہ اضطراب ہے

---

اے داغ دل اسے کھوئے ہوئے دل کی نشانی آ فانی بیدل تجھے سینہ سے لگا لے

---

عالم ہستی یارب کیا آباد نما ویرانہ ہے جس نے یہاں کچھ ہوش سنبھالا اپنے ہی دیوانہ ہے
کسکو یہاں امید خبر ہم دل کو سمجھا لیتے ہیں حال دل اس سے یوں کہتے ہیں گویا اک افسانہ ہے

---

میں بھی اک پرتو ہستی ہوں مگر کیا کہیے قطرۂ دریا سہی کس قطرے کو دریا کہیے
تھی نظر صرف تماشا وہ زمانہ گذرا اب کوئی سن مری آنکھوں کو تماشا کہیے

---

جادو جگا گئی ہے جیسے نظر کی مستی بیہوش مستقل ہے اس رہگذر کی بستی

---

# قطعات

یاس ہے اور خاطرِ بیتاب — آرزو ہے نہ کوئی حسرت ہے
عمرِ جاوید اب عزیز نہیں — جانِ فانی کو عزمِ رحلت ہے

---

اب وہ راتیں کہاں شباب کہاں — ہو گئی صبح وقتِ خواب کہاں
یاس ہے اب نہ آرزو فانی — دل ہو بیتاب اب یہ تاب کہاں

---

دم لینے کی تو مہلت ملنا ہی چاہیئے تھا
دن رات بحرِ غم میں کیا غرق چاہیئے تھا
فانی کی زندگی بھی کچھ زندگی تھی یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیئے تھا

---

# رباعیات

ناکام ازل کی کامرانی معلوم
قسمت میں نہو تو شادمانی معلوم
جینے سے مراد ہے نہ مرنا شاید
ورنہ فانی کی زندگانی معلوم

---

بُلبل کو چمن کی زندگی راس آئی
پھولوں کو غریب الوطنی راس آئی
فانی کو نہ زندگی میں راس آیا کچھ
آئی بھی تو ایک موت ہی راس آئی

---

کچھ خیر سے یادِ یار میں گذری عمر
کچھ موت کے انتظار میں گذری عمر
آیا بھی اگر ہوش تو بے چین رہے
کچھ نشہ میں کچھ خمار میں گذری عمر

---

کچھ کام نہیں تو نام کر جانے دے
یارب دُنیا سے اب گذر جانے دے
مر مر کے جیے جائے کہاں تک فانی
جینا نہیں منظور تو مر جانے دے

---

نیرنگیٔ حیات و جذبات ہوں میں
جو فہم سے ہو بعید وہ بات ہوں میں
جس رات کے دوپہر ہو ہستی و عدم
فانیؔ بیمارِ غم کی وہ رات ہوں میں

---

آماجگہ ناوکِ آفات ہوں میں
تلخیٔ کشِ زہرِ عشیِ مافات ہوں میں
عبرت کدۂ دہر میں شاید فانیؔ
جینا ہے گناہ اور مکافات ہوں میں

---

# عرضِ حال

یاد ایام عیش برنائی
ہم ہیں اب اور کنج تنہائی

نہ رہی آرزوئے صبرِ شکن
اب نہیں حسرتِ شکیبائی

سیرِ نظارۂ جمال نہیں
اپنے ہم آپ ہیں تماشائی

بھول بیٹھے ہم اک زمانہ ہوا
محفل آرائی و خود آرائی

دل کہ تھا آشنائے ذوقِ نظر
ہم کہ تھے وصل کے تمنائی

ہم وہی، دل وہی سہی لیکن
نہ وہ سودا نہ ہم وہ سودائی

اب نہ وہ آہِ دم بدم کا ہجوم
اب نہ وہ غم کی کارفرمائی

فرصتِ شوق ہے نہ رخصتِ ہوش
کوچہ گردی نہ دشت پیمائی

لحنِ بلبل جگر خراش ہے اب
نہیں بھاتی گلوں کی رعنائی

دل ہی مرجھا گیا نہ ہوا اپنا
کہ چمن میں تو ہے بہار آئی

کیجیے اب وداعِ سیرِ چمن
خار ہے وہ کلی جو مرجھائی

آ اب اے مرگِ ناگہانی آ — سخت مضطر ہیں تیرے شیدائی
چارۂ دردِ زندگی تو ہے — کر اگر ہو سکے مسیحائی

فانیؔ تلخ کام کی امید
تو اگر آگئی تو بر آئی

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

محمد ثاقب ریاض: 03447227224
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067